رجب المرجب ۱۴۳۷ھ

اپریل ۲۰۱۶ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات

تنظیمِ اسلامی

بانی: ڈاکٹر اسرار احمد

اطاعتِ رسول ﷺ

ایمان کی علامت ہے

(مطالعہ حدیث)

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ

داعی رجوع الی القرآن بانی تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

حصہ اول سورۃ الفاتحہ و سورۃ البقرۃ مع تعارفِ قرآن
(بارہواں ایڈیشن) ——— صفحات:360، قیمت 475 روپے

حصہ دوم سورۃ آلِ عمران تا سورۃ المائدہ
(دسواں ایڈیشن) ——— صفحات 321، قیمت 425 روپے

حصہ سوم سورۃ الانعام تا سورۃ التوبہ
(ساتواں ایڈیشن) ——— صفحات 331، قیمت 425 روپے

حصہ چہارم سورۃ یُونس تا سورۃ الکہف
(چھٹا ایڈیشن) ——— صفحات 394، قیمت 485 روپے

حصہ پنجم سُورۃُ مریم تا سُورۃُ السّجدۃ
(پانچواں ایڈیشن) ——— صفحات 480، قیمت 575 روپے

حصہ ششم سُورۃُ الاحزاب تا سُورۃُ الحجرات
(چوتھا ایڈیشن) ——— صفحات 484، قیمت 590 روپے

حصہ ہفتم سُورۃُ قٓ تا سُورۃُ النّاس
(دوسرا ایڈیشن) ——— صفحات 560، قیمت 650 روپے

یکے از مطبوعات: انجمن خُدّام القرآن خیبر پختونخوا پشاور

شائع کردہ: مکتبہ خُدّام القرآن لاہور

K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد : 65

شمارہ : 4

رجب المرجب 1437ھ

اپریل 2016ء

فی شمارہ 30/-

مدیر
حافظ عاکف سعید

نائب مدیر
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِتعاون

- اندرون ملک 300 روپے
- بھارت وبنگلہ دیش 900 روپے
- ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ 1200 روپے
- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ 1500 روپے

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700 ' فون: 3-35869501

فیکس: 35834000، ای میل: maktaba@tanzeem.org

ای میل برائے ادارتی امور: publications@tanzeem.org

ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔ علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو، لاہور

فون: 36316638 - 36366638

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

- **عرضِ احوال** — 5
  - ریاست اور مذہب کی جنگ — ادارہ
- **بیانُ القُرآن** — 9
  - سورۃُ النُّور (آیات ۴۱ تا ۶۴) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ
- **مطالعۂ حدیث** — 33
  - اطاعتِ رسول ﷺ ایمان کی علامت ہے — ڈاکٹر اسرار احمدؒ
- **تذکّر و تدبّر** — 55
  - قرآن کریم کی اُصولی باتیں (۸) — ڈاکٹر عمر بن عبداللہ المقبل
- **تعمیرِ سیرت** — 67
  - فضائل اخلاق — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ
- **تقدیرِ امم** — 71
  - مسلمانوں کا عروج وزوال — سید وجاہت علی
- **دعوتِ فکر** — 78
  - دارالعلوم دیوبند کے قیام کا مقصد اور موجودہ مدارس کا کردار — پروفیسر محمد انس حسان
- **یادِ رفتگاں** — 91
  - حاجی عبدالواحد صاحبؒ کی یادداشتیں (۵) — پروفیسر حافظ قاسم رضوان

❁ ❁ ❁

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

ریاست اور مذہب کی جنگ

بیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں خلافت اسلامیہ کا خاتمہ ہوا اور ایک عرصہ ہوا ریاست' پارلیمنٹ اور آئین کا تصور بھی پروان چڑھ چکا تھا۔ مسلم خطوں میں بھی اس تصور کو پروان چڑھانے کے لیے خصوصی طور پر اہتمام کیا گیا۔ اگر تاریخ کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مغربی استعمار نے نوآبادیات میں لوگوں کو ایک طرف معاشی طور پر بدحال کر کے اور دوسری طرف مادّی ترقی کی چکا چوند کے تاثر سے اپنا طرزِ زندگی اختیار کرنے کے لیے مجبور کیا اور جب تک ان معاشروں میں انہی کی طرح کی ایک کلاس نے جنم نہیں لے لیا انہوں نے وہاں سے اپنا قبضہ ختم نہیں کیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ افریقہ سے لے کر انڈونیشیا تک مغربی استعماری قوتیں جہاں جہاں سے بھی نکلتی گئیں وہاں یا تو مغرب ساختہ جمہوری طرزِ حکومت مسلط کر دی گئی' یا پھر جہاں عوام شعوری طور پر اس نظام کے لیے تیار نہیں تھے وہاں مغرب نواز بادشاہتیں قائم کر دی گئیں۔ دونوں صورتوں میں اقتدار کی منتقلی زیادہ تر انہی عناصر کو کی گئی جو ان ہی کے تربیت یافتہ اور انہی کی طرح کا طرزِ زندگی اختیار کیے ہوئے تھے۔ اس ایلیٹ کلاس کو مغرب سے ایک ریاست' ایک پارلیمنٹ اور ایک آئین کا جو تصور ورثے میں ملا تھا اس کو اس کلاس کی مغرب نوازی نے مزید پروان چڑھایا۔ یہاں تک کہ اسلامی نظامِ سیاست کا تیرہ سو سالہ تصور محو ہوتا چلا گیا۔ رہی سہی کسر اس کلاس کے کٹھ پتلی حکمرانوں کی حرصِ اقتدار اور مغرب نواز پالیسیوں نے پوری کر دی اور اس بات کا پورا اہتمام کر دیا گیا کہ مذہب کو ریاست کے قریب پھٹکنے بھی نہ دیا جائے۔

پھر مذہب اور ریاست کی جنگ میں ایک نیا موڑ آتا ہے' جب بعض مسلم خطوں میں احیائے اسلام کی تحریکیں از سرِ نو نفاذِ اسلام کی جدوجہد کا آغاز کرتی ہیں اور بعض اسلامی ممالک قدرتی وسائل کی بناء پر ثروت مندی اور استحکام حاصل کرتے ہیں تو انہیں عدم استحکام کا شکار کرنے اور اُبھرتی ہوئی اسلامی نظام کی تحریکوں کو بدنام کرنے کے لیے مغرب کو دہشت گرد تنظیموں کی ضرورت پڑتی ہے۔ چنانچہ اس مرحلے پر بھی ایلیٹ کلاس مذہب اور ریاست کی اس جنگ میں مغرب کے فرنٹ لائن اتحادی کے طور پر نظر آتی ہے اور دہشت گردی کے نام پر اسلام کو بدنام کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی۔ موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے مغرب اسلامی نظام کی تحریکوں کا ناطہ شدت پسندی اور دہشت گردی سے جوڑ کر انہیں کچلنے' مسلنے اور ان کا راستہ مسدود کرنے کا بیڑا اُٹھاتا ہے تو یہ ایلیٹ کلاس آگے

بڑھ کر مغرب کے ایجنڈے پر عمل درآمد کو یقینی بناتی ہے۔ چنانچہ مصر میں الاخوان کی تحریک کو کچلنے کا معاملہ ہو یا افغانستان پر چڑھائی کا' ایلیٹ کلاس درندگی میں مغرب کو بھی پیچھے چھوڑ گئی۔

مذہب کو ریاست سے دور رکھنے کے لیے مغربی معالجوں نے لبرل ازم کا (بے دینی' بے حیائی اور فحاشی کا مرکب) معجون بطور نسخہ تجویز کیا تو ایلیٹ کلاس نے اسے اکثیر اعظم کے طور پر ہاتھوں ہاتھ لیا اور میڈیا کے میٹھے مشروب میں گھول کر اپنے معاشرے میں انڈیلنے میں دیر نہیں لگائی' بلکہ احتیاطی تدابیر کے طور پر اسلامی انقلابی راہنماؤں کی تصانیف سے استفادہ سے مکمل پرہیز عالم اسلام کے لیے لازمی قرار دے دیا گیا۔ چنانچہ جون ۲۰۱۵ء میں مصر میں الاخوان راہنماؤں سید قطب' حسن البناء اور یوسف القرضاوی سمیت کئی دوسرے راہنماؤں کی کتب کی بڑی تعداد ضبط کر لی گئی۔ اس خدشے کی بنا پر کہ یہ کتب نوجوان نسل کے ذہنوں کو خراب کرنے اور انہیں انتہا پسندی کی طرف لے جانے کا موجب بن سکتی ہیں' ان کتب کی تقسیم و اشاعت پر پابندی لگا دی گئی۔ دسمبر ۲۰۱۵ء میں سعودی عرب میں بھی سید قطب' حسن البناء' یوسف القرضاوی اور مولانا مودودی کی کتب پر پابندی عائد کر دی گئی۔

ایلیٹ کلاس کی بدقسمتی یہ ہے کہ اسلامی انقلابی راہنماؤں کی فہرست میں مصور پاکستان علامہ اقبال بھی شامل ہیں' جو ریاست اور مذہب کی جنگ میں واضح طور پر مذہب کے نہ صرف طرفدار ہیں بلکہ ملت سے اس سے وابستہ رہنے اور وطنیت کا بت توڑنے کی پرزور اپیل بھی کرتے ہیں ؎

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام تیرا دیس ہے تو مصطفوی ہے

اقبال مارچ ۱۹۳۸ء میں ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

''میں نظریۂ وطنیت کی تردید اس زمانہ سے کر رہا ہوں جبکہ دنیائے اسلام اور ہندوستان میں اس نظریہ کا کچھ ایسا چرچا بھی نہ تھا۔ مجھ کو یورپین مصنفوں کی تحریروں سے ابتدا ہی سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہوگئی تھی کہ یورپ کی دلی اغراض اس امر کی متقاضی ہیں کہ اسلام کی وحدتِ دینی کو پارہ پارہ کرنے کے لیے اس سے بہتر کوئی حربہ نہیں کہ اسلامی ممالک میں نیرنگی نظریۂ وطنیت کی اشاعت کی جائے۔ چنانچہ ان لوگوں کی یہ تدبیر جنگ عظیم (اول) میں کامیاب ہوگئی۔''

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

''اگر بعض علمائے مسلم اس فریب میں مبتلا ہیں کہ دین اور وطن بحیثیت ایک سے اسی تصور

کے یکجا رہ سکتے ہیں تو میں مسلمانوں کو ہر وقت انتباہ کرتا ہوں کہ اس راہ سے آخری مرحلہ اول تو لادینی ہوگی اور اگر لادینی نہیں تو اسلام کو محض ایک اخلاقی نظریہ سمجھ کر اس کے اجتماعی نظام سے لاپرواہی۔''

اب ایلیٹ کلاس علامہ اقبال کی شاعری پر پابندی تو لگانے سے رہی' لیکن ہار کہاں ماننے والی تھی' لہٰذا یوم اقبال پر سرکاری تعطیل ختم کر دی گئی تاکہ اس توسط سے عوام کے دل و دماغ میں اقبال کے انقلابی نظریات کی یاد تازہ نہ ہونے پائے۔ اور اس کے ساتھ ہی دجالی میڈیا اور ایلیٹ کلاس کے وظیفہ خوار نام نہاد دانشوروں نے اقبال کو لبرل اور جمہوریت کا حامی ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگانا شروع کر دیا۔ لیکن اقبال کے نظریات و افکار اس قدر واضح ہیں کہ ایلیٹ کلاس کی یہ کوشش انگلی کے پیچھے سورج چھپانے کے مترادف ثابت ہوگی۔ تاہم مذہب اور ریاست کی اس جنگ میں ایلیٹ کلاس نے مغرب کا ساتھ دینا ہی دینا ہے' چاہے حقائق اور نتائج کچھ بھی ہوں۔ چاہے اس کے لیے مدرسوں اور تبلیغی جماعتوں پر بلاجواز پابندیاں لگانی پڑیں' چاہے آئین میں ترامیم کرنی پڑیں یا چاہے ۵۴ ملکی اتحاد بنانا پڑے۔

لیکن ایک چبھتا ہوا سوال یہ ہے کہ ریاست کی مذہب کے خلاف یہ جنگ صرف اسلامی دنیا تک کیوں محدود ہے؟ غیر اسلامی دنیا میں تو مذہب ریاست پر حاوی ہو رہا ہے۔ پوری دنیا میں سیکولرازم اور جمہوریت کے ٹھیکیدار امریکہ کو ہی لیجیے۔ ڈونلڈ ٹرمپ تعصب' انتہا پسندی اور مسلمان دشمنی کی حدوں کو پھلانگنے کے باوجود امریکہ میں مقبول ترین لیڈر کے طور پر اُبھر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسے امریکی عوام کی حمایت حاصل ہو رہی ہے۔ تعصب اور انتہا پسندی پر مبنی اعلانات جو وہ کر رہا ہے' اس کے ذاتی نہیں بلکہ پارٹی کے منشور کا حصہ ہیں۔ اس حقیقت کا انکشاف بی بی سی جیسے مستند ذرائع ابلاغ کر رہے ہیں۔

''پارٹی کے لیڈر کہتے ہیں شام اور عراق میں اتنے بم برساؤ کہ زمین فلیٹ ہو جائے۔ یعنی بچے' بوڑھے' بے گناہ بھی اگر اس کی زد میں آئیں تو اس کی پروا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ٹرمپ تمام مسلمانوں کو کچھ وقت کے لیے امریکہ میں گھسنے سے روکنے کی بات کرتے ہیں تو بس ڈگری کا فرق ہے۔ ٹرمپ وہی باتیں لاؤڈ سپیکر پر بول رہے ہیں جو پارٹی کئی بار سرگوشی کے انداز میں کہتی رہی ہے۔''

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے غیر مسلم دنیا کی ہر جماعت شیو سینا ہے اور ہر لیڈر مودی جیسے عزائم رکھتا ہے' لیکن نہ تو کسی ایسے لیڈر پر انتہا پسندی اور شدت پسندی کے الزامات لگتے ہیں اور نہ ایسی جماعتوں اور تنظیموں پر پابندیاں عائد ہوتی ہیں۔ حیدر آباد میں ہزاروں مسلمانوں کو زندہ جلانے والا بھارت کا وزیراعظم بن جاتا ہے۔ یہودیوں کا ظلم و جبر' برما میں مسلمانوں کی نسل کشی' سیکولرازم اور جمہوریت کے علمبردار مغرب میں اسلامی شعائر اور ناموسِ رسالت پر نازیبا حملے' مسلمانوں کے خلاف منظم مظاہرے' یہ سب دنیا کو نظر نہیں آتا؟ ذرا پیچھے جائیں تو ۹/۱۱ کے بعد صلیبی جنگوں کے آغاز کا اعلان

اور دہشت گردی کے نام پر مسلمانوں کی نسل کشی' افغانستان' عراق میں شہریوں پر بموں کی بارش کیا مذہبی تعصب کی بنیاد پر نہیں تھی؟ ٹھیک اسی زمانہ میں جب اسلامی دنیا میں ریاست کا تصور انجیکٹ کیا جا رہا تھا دوسری طرف مذہب کی بنیاد پر اسرائیل کی بنیاد رکھی جا رہی تھی۔

یعنی کسی بھی دور میں مغرب اور غیر مسلم دنیا میں ریاست مذہب سے اس قدر لاتعلق نہیں رہی جتنا کہ ہمارے ہاں ایلیٹ کلاس مذہب کو دیس نکالا دینے پر تلی ہوئی ہے۔ ان حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے ثابت ہوتا ہے کہ جسے ہم آج تک مذہب اور ریاست کی جنگ سمجھتے رہے ہیں وہ درحقیقت ریاست اور اسلام کی جنگ ہے اور اس کا سب سے بڑا مقصد صرف اتنا ہے کہ اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی دوبارہ اُبھر کر کہیں سفید سامراج کے سامنے کھڑا نہ ہو جائے۔ اگر دنیا کے کسی خطے میں اسلامی نظام عملاً نافذ ہو گیا اور انسانیت اس کے فطری ثمرات سے مستفید ہونا شروع ہو گئی تو مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام اور جمہوری طرزِ حکومت کا دجل و فریب اور استحصال سامنے آ جائے گا۔ جیسا کہ صرف چھ سالہ امارتِ اسلامی افغانستان کے دوران محض تنقیدی جائزہ' جاسوسی اور دیگر عزائم لے کر آنے والے کئی ایجنٹ اور صحافی متاثر ہو کر مسلمان ہو گئے اور واپس جا کر اپنے ہی معاشرے اور نظام کے ناقد بن گئے۔ لہٰذا کہیں مصر میں اسلامی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا جاتا ہے تو کہیں افغانستان میں امارتِ اسلامی کو مسمار کر دیا جاتا ہے۔ لیکن اسلام اور ریاست کی یہ جنگ اب جس نئے دور میں داخل ہو رہی ہے اس میں اسلام پسندوں کی نسبت ایلیٹ کلاس کے لیے زیادہ آزمائشیں ہیں' کیونکہ اب ایک طرف مغرب کی ڈیمانڈ ایسے اقدامات' اسمبلیوں میں ایسے بل' عدالتوں سے ایسے فیصلے اور ایسی حکومتی پالیسیاں ہوں گی جن سے مذہبی طبقہ میں اشتعال بڑھے گا اور دوسری طرف مذہبی طبقہ کو مسلمان حکومتیں کے روبرو کھڑا کر کے تصادم کی کیفیت پیدا کرنا تازہ مغربی ایجنڈے کا حصہ ہے اور اس صورت میں ایلیٹ کلاس کو جان لینا چاہیے کہ قذافی سے مضبوط حکومت شاید موجودہ دور میں کوئی بھی نہ ہو۔

جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے تو حکمرانوں کو یہ یاد ہونا چاہیے کہ پون صدی قبل جب یہاں کے مسلمانوں کو مذہب اور ریاست میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑا تو انہوں نے مذہب کا انتخاب کیا۔ لہٰذا تازہ مغربی ایجنڈے کے مطابق جب ریاست اور اسلام کی جنگ شروع ہو گی تو یہاں کے مسلمان مذہب کے حق میں ہی فیصلہ دیں گے' لہٰذا حالات کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے ہمارے حکمرانوں اور ایلیٹ کلاس کو چاہیے کہ وہ مغرب کا ساتھ دینے کی بجائے اسلام کا ساتھ دے' کیونکہ تازہ مغربی ایجنڈے کے تناظر میں اب شاید ان کی مغرب نواز پالیسیاں' حقوقِ نسواں بل اور آئین اور ریاست کے بیانیہ میں ترامیم بھی ان کے کام نہ آ سکیں۔

❁ ❁ ❁

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃُ النُّوْر

آیات ۴۱ تا ۵۷

لَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ۭ كُلٌّ
عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ۝ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ ۚ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ۝ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِيْ سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهٗ
ثُمَّ يَجْعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَاۗءِ مِنْ
جِبَالٍ فِيْهَا مِنْۢ بَرَدٍ فَيُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ يَّشَاۗءُ ۭ يَكَادُ
سَنَا بَرْقِهٖ يَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ ۝ يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ
لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ۝ وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَاۗبَّةٍ مِّنْ مَّاۗءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ
عَلٰي بَطْنِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰي رِجْلَيْنِ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰٓى
اَرْبَعٍ ۭ يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَاۗءُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍ
مُّبَيِّنٰتٍ ۭ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ وَيَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا
بِاللّٰهِ وَبِالرَّسُوْلِ وَاَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۭ وَمَآ
اُولٰۗىِٕكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَاِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ
مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ وَاِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْٓا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ ۝ اَفِيْ
قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْٓا اَمْ يَخَافُوْنَ اَنْ يَّحِيْفَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُوْلُهٗ ۭ
بَلْ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ
رَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَىِٕنْ اَمَرْتَهُمْ لَيَخْرُجُنَّ ۭ قُلْ لَّا تُقْسِمُوْا ۚ
طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا
الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ۭ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ
تَهْتَدُوْا ۭ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ
قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ
بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـــًٔا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ
فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ
لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ
وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۭ وَلَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝

آیت ۴۱ ﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ’’کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ کی تسبیح کرتے ہیں جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہیں‘‘

نہ صرف آسمانوں اور زمین کی تمام مخلوقات اللہ کی تسبیح کرتی ہیں بلکہ ان دونوں (آسمان و زمین) کے مابین جو مخلوق ہے وہ بھی اس میں شامل ہیں۔

﴿وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ۭ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ۭ﴾ ’’اور پروں کو پھیلائے ہوئے پرندے بھی۔ ہر ایک نے جان لی ہے اپنی نماز اور تسبیح۔‘‘

یہی مضمون سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۴۴ میں اس طرح آیا ہے: ﴿وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ۭ﴾ کہ کوئی چیز اس کائنات میں ایسی نہیں ہے جو اللہ کی تسبیح و تحمید نہ کر رہی ہو‘ لیکن تم لوگوں کو ان کے طریقہ تسبیح کا شعور نہیں ہو سکتا۔

﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ۝۴۱﴾ ’’اور اللہ خوب جانتا ہے جو وہ کرتے ہیں۔‘‘

آیت ۴۲ ﴿وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ۝۴۲﴾ ’’اور اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی‘ اور اللہ ہی کی طرف لوٹ جانا ہے۔‘‘

آیت ۴۳ ﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِيْ سَحَابًا﴾ ’’کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ ہانک کر لاتا

ہے بادلوں کو‘‘

سمندر کے بخارات سے بادل بنتے ہیں اور ہواؤں کے دوش پر ہزاروں میل کا سفر طے کر کے کہیں کے کہیں پہنچ جاتے ہیں۔

﴿ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهٗ ثُمَّ يَجْعَلُهٗ رُكَامًا﴾ ’’پھر وہ انہیں آپس میں جوڑ دیتا ہے‘ پھر انہیں تہ برتہ کر دیتا ہے‘‘

جن لوگوں کو ہوائی سفر کا تجربہ ہے انہوں نے بادل کے تہ برتہ ہونے کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوگا۔ ابر آلود موسم میں بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ بادلوں کی ایک تہ میں سے جہاز اوپر چڑھتا ہے اور اس کے بعد فضا صاف ہوتی ہے۔ پھر اوپر جا کر بادلوں کی ایک اور تہ ہوتی ہے۔ اس طرح متعدد تہیں ہو سکتی ہیں۔

﴿فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ﴾ ’’تو تم دیکھتے ہو کہ بارش ان کے درمیان میں سے برستی ہے‘‘

﴿وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْۢ بَرَدٍ﴾ ’’اور اللہ آسمان سے —— اس کے اندر کے پہاڑوں سے —— اولے برساتا ہے۔‘‘

جب زمین پر اولے پوری شدت سے برس رہے ہوں تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے آسمانوں میں اولوں کے پہاڑ ہیں۔

﴿فَيُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَيَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ يَّشَآءُ﴾ ’’تو وہ پہنچاتا ہے ان (اولوں) کو جس پر چاہتا ہے اور ان کا رخ پھیر دیتا ہے جس سے چاہتا ہے۔‘‘

جب کسی کھیتی کو کسی وجہ سے برباد کرنا مقصود تو اس پر اللہ کی مشیت سے یہ اولے برس پڑتے ہیں اور جس کھیتی کو وہ تباہ کرنا نہیں چاہتا اس کی طرف سے ان کا رخ پھیر دیتا ہے۔ بعض اوقات دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک کھیت اولوں سے تباہ ہو گیا‘ لیکن اس کے ساتھ ہی دوسرا کھیت بالکل سلامت رہا۔

﴿يَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ يَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ ﴿۴۳﴾﴾ ’’قریب ہے کہ اس کی بجلی کی کوند لوگوں کی نگاہوں کو اُچک لے جائے۔‘‘

آیت ۴۴ ﴿يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ﴿۴۴﴾﴾

’’اللہ ادلتا بدلتا رہتا ہے رات اور دن کو۔ یقیناً اس میں عبرت کا سامان ہے آنکھوں والوں کے لیے۔‘‘

آیت ۴۵ ﴿وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ ۚ﴾ ’’اور اللہ نے بنایا ہے ہر جاندار کو پانی سے‘ تو ان میں کچھ ایسے (جانور) ہیں جو اپنے پیٹ کے بل چلتے ہیں۔‘‘

یہ وہ جاندار ہیں جنہیں ہم reptiles کہتے ہیں۔ ان کی ٹانگیں وغیرہ نہیں ہوتیں اور وہ پیٹ کے بل رینگتے ہیں۔

﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ ۚ﴾ ’’اور ان میں کچھ وہ ہیں جو دو ٹانگوں پر چلتے ہیں‘‘

خود ہم انسان بھی اسی مخلوق میں شامل ہیں۔ انسانوں کے علاوہ پرندے‘ بن مانس (champanzies) اور گوریلے بھی دو ٹانگوں پر چلتے ہیں۔ کوئی اور مخلوق بھی ایسی ہو سکتی ہے جو دو ٹانگوں پر چلتی ہو۔

﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰٓى اَرْبَعٍ ۭ﴾ ’’اور ان میں کچھ ایسے ہیں جو چار ٹانگوں پر چلتے ہیں‘‘

زمینی حیوانات میں سے چار ٹانگوں والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔

﴿يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴۵﴾﴾ ’’اللہ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے۔ یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔‘‘

آئندہ آیات میں منافقین کا ذکر ہونے جا رہا ہے۔ اس سے پہلے سورۂ یونس سے لے کر سورۃ المؤمنون تک چودہ سورتیں مسلسل مکیات تھیں۔ مکہ میں منافقین تو تھے نہیں لہٰذا ان تمام مکی سورتوں میں نہ تو نفاق کا ذکر آیا اور نہ ہی منافقین کا تذکرہ ہوا۔ ان مکی سورتوں میں گفتگو کا رخ زیادہ تر مشرکین مکہ کی طرف ہی رہا ہے۔ کہیں کہیں اہلِ کتاب کا ذکر بھی آیا ہے‘ لیکن انہیں براہِ راست مخاطب نہیں کیا گیا۔ اس کے علاوہ ان سورتوں میں حضور ﷺ کو اور آپؐ کی وساطت سے اہل ایمان کو بھی مخاطب کیا جاتا رہا ہے۔ سورۃ النور کا نزول مدنی دور کے عین وسط یعنی ۶ ہجری میں ہوا تھا اور اُس وقت مدینہ کے اندر اچھی خاصی تعداد میں منافقین موجود تھے۔ یہی

وجہ ہے کہ ان کے کردار کا تذکرہ اس سورت میں آیا ہے۔

آیت ۴۶ ﴿لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ ؕ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۴۶﴾﴾ ''ہم نے نازل کر دی ہیں روشن آیات۔ اور اللہ ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے سیدھے راستے کی طرف۔''

آیت ۴۷ ﴿وَيَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالرَّسُوْلِ وَاَطَعْنَا﴾ ''اور (کچھ لوگ وہ بھی ہیں جو) کہتے ہیں ہم ایمان لائے اللہ اور رسولؐ پر اور ہم نے اطاعت قبول کی''

﴿ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ﴾ ''پھر اس کے بعد ان میں سے ایک فریق پیٹھ پھیر جاتا ہے۔''

یہ لوگ اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان کا اقرار بھی کرتے ہیں' اطاعت کا دم بھی بھرتے ہیں لیکن اس کے بعد ان کا طرز عمل کچھ اور ہوتا ہے۔

﴿وَمَآ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۷﴾﴾ ''اور یہ لوگ درحقیقت مؤمن نہیں ہیں۔''

آیت ۴۸ ﴿وَاِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۴۸﴾﴾ ''اور جب انہیں بلایا جاتا ہے اللہ اور اُس کے رسولؐ کی طرف کہ وہ ان کے مابین فیصلہ کریں' تو اُس وقت ان میں سے ایک گروہ کنّی کترا جاتا ہے۔''

منافقین کے اس رویّے کا ذکر سورۃ النساء میں بھی آیا ہے۔ یہ لوگ فیصلوں کے لیے اپنے تنازعات رسول اللہ ﷺ کے بجائے یہودیوں کے پاس لے جانے کو ترجیح دیتے تھے۔ اس لیے کہ حضور ﷺ کے فیصلے مبنی برانصاف ہونے کی وجہ سے عام طور پر ان کے خلاف ہی جاتے تھے۔

آیت ۴۹ ﴿وَاِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْٓا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ ﴿۴۹﴾﴾ ''اور اگر حق ان کے لیے ہو تو وہ آتے ہیں رسولؐ کی طرف بڑے اطاعت کیش بن کر۔''

اگر کسی معاملہ یا تنازعہ میں وہ حق بجانب ہوں اور انہیں یقین ہو کہ فیصلہ انہی کے حق میں ہوگا تو اس معاملے کو لے کر بڑے اطاعت شعار بنتے ہوئے پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ وہ حضور ﷺ کے پاس آجاتے ہیں۔

آیت ۵۰ ﴿اَفِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْٓا اَمْ يَخَافُوْنَ اَنْ يَّحِيْفَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُوْلُهٗ ؕ﴾ ''کیا ان کے دلوں میں روگ ہے؟ یا یہ لوگ شک میں مبتلا ہیں؟ یا انہیں

اندیشہ ہے کہ اللہ اور اس کا رسولؐ ان کے ساتھ ناانصافی کریں گے؟''

﴿بَلْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۵۰﴾﴾ ''بلکہ حقیقت میں یہی لوگ ظالم ہیں۔''

چونکہ یہ لوگ حقیقی ایمان سے محروم ہیں' اس لیے اس کھوٹ کا عکس ان کے کرداروں میں نمایاں ہے۔

آیت ۵۱ ﴿اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ؕ﴾ ''حقیقی مؤمنین کو تو جب اللہ اور اُس کے رسولؐ کی طرف بلایا جاتا ہے کہ وہ ان کے مابین فیصلہ کریں تو ان کا قول بس یہی ہوتا ہے کہ ہم نے سنا اور ہم نے مانا!''

کہ ہم تو فیصلے کے لیے رسول اللہ ﷺ کے حضور حاضر ہیں۔ آپ ﷺ جو بھی فیصلہ کریں گے ہمیں بسروچشم قبول ہوگا۔

﴿وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۵۱﴾﴾ ''اور وہی لوگ ہیں فلاح پانے والے۔''

آیت ۵۲ ﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۵۲﴾﴾ ''اور جو کوئی اللہ اور اُس کے رسولؐ کی اطاعت کرتا ہے اور اللہ کا خوف رکھتا ہے اور اس کا تقویٰ اختیار کرتا ہے' تو وہی لوگ ہیں جو کامیاب ہونے والے ہیں۔''

آیت ۵۳ ﴿وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ اَمَرْتَهُمْ لَيَخْرُجُنَّ ؕ﴾ ''اور وہ اللہ کی قسمیں کھا کر کہتے ہیں' اپنی امکانی حد تک پکی قسمیں کہ اگر آپؐ انہیں حکم دیں گے تو وہ ضرور نکلیں گے۔''

منافقین سے جب بھی کسی قربانی کا تقاضا کیا جاتا یا جہاد کے لیے نکلنے کا مرحلہ آتا تو وہ بہانے تراشتے ہوئے قسمیں کھاتے کہ ہمیں فلاں مجبوری ہے' فلاں مسئلہ درپیش ہے' لیکن اگر آپؐ حکم دیں گے تو ہم بہرحال آپؐ کے ساتھ ضرور نکلیں گے۔ جماعتی زندگی میں یہ نمونہ آج بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ امیر کی طرف سے ایک واضح حکم آجانے کے بعد بھی کچھ لوگ بہانے بناتے ہیں' اپنی معذوری کا اظہار کرتے ہیں اور مجبوریاں گنوانے کے بعد یوں بھی کہتے ہیں کہ ''ویسے اگر آپ حکم دیں تو ہم حاضر ہیں!'' گویا جو پہلے حکم دیا گیا ہے وہ حکم نہیں ہے؟ امیر کی بات کو آپ حکم کیوں نہیں سمجھ رہے؟

تو کیا جہاد کے لیے ایک واضح حکم کے بعد منافقین یہ توقع رکھتے ہیں کہ حضور ﷺ ان میں سے ہر ایک کی الگ الگ خوشامد کر کے اسے راضی کریں کہ اجی! آپ ضرور جہاد کے لیے تشریف لے جائیں!

﴿قُلْ لَّا تُقْسِمُوْا ۚ طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ ؕ﴾ ''آپؐ ان سے کہیے کہ تم لوگ قسمیں نہ کھاؤ' بس معروف طریقے سے اطاعت اختیار کرو۔''

جب تم لوگ مجھے اللہ کا رسول تسلیم کرنے اور مجھ پر ایمان لانے کا دعویٰ کرتے ہو تو باقی تمام اہلِ ایمان کی طرح میری اطاعت اختیار کرو۔ میری طرف سے جو حکم تمہیں دیا جاتا ہے اسے قبول کرو۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۵۳﴾ ''یقیناً جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔''

آیت ۵۴ ﴿قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) آپ کہیے کہ تم لوگ اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول ﷺ کی۔''

قبل ازیں سورۃ النساء کے مطالعہ کے دوران وضاحت کی جا چکی ہے کہ منافقین پر تین امور بہت بھاری تھے۔ یعنی حضور ﷺ کی شخصی اطاعت' جہاد و قتال کے لیے نکلنا اور ہجرت۔ چنانچہ آیت زیر نظر میں ان تین میں سے پہلے معاملے یعنی اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کے بارے میں تاکید کی جا رہی ہے۔

﴿فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ۚ﴾ ''پھر اگر تم مُنہ موڑتے ہو تو سن رکھو کہ ہمارے نبیؐ پر صرف وہی ذمہ داری ہے جو اُنؐ پر ڈالی گئی ہے اور تم پر وہ ذمہ داری ہے جو تم پر ڈالی گئی ہے۔''

رسول اللہ ﷺ کی ذمہ داری لوگوں تک اللہ کا پیغام پہنچانے کی حد تک ہے اور آپؐ سے اسی ذمہ داری کے سلسلے میں پوچھا جائے گا۔ اب جب آپ ﷺ نے تم لوگوں تک اللہ کا پیغام پہنچا کر اپنی یہ ذمہ داری ادا کر دی ہے تو اس کے بعد ان احکام کی تعمیل کرنا اور اللہ کے دین کے لیے تن من دھن قربان کرنا تم لوگوں کی ذمہ داری ہے اور تم لوگ اپنی اسی ذمہ داری کے بارے میں اللہ کے ہاں مسئول ہو گے۔

ان الفاظ میں جماعتی زندگی کے نظم و ضبط کے بارے میں ایک بہت ہی اہم اور بنیادی راہنما اصول فراہم کیا گیا ہے کہ ہر کوئی اپنی اس ذمہ داری کی فکر کرے جس کے بارے میں وہ مسئول ہے۔ جماعتی زندگی میں انفرادی سطح پر اکثر شکایات پیدا ہو جاتی ہیں' یہاں تک کہ ایک غزوہ کے موقع پر حضور ﷺ جب مالِ غنیمت تقسیم کر رہے تھے تو بنی تمیم کے ایک شخص نے کہا: اِعْدِلْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! ''اے اللہ کے رسول' آپ عدل کریں!'' گویا (نعوذ باللہ) آپؐ عدل نہیں کر رہے تھے۔ اس گستاخی کے جواب میں آپ ﷺ نے غصے میں فرمایا: ((وَيْلَكَ' وَمَنْ يَعْدِلُ اِذَا لَمْ اَعْدِلْ؟)) (۱) ''تم برباد ہو جاؤ' اگر میں عدل نہیں کروں گا تو پھر کون عدل کرے گا؟'' اسی طرح جماعتی زندگی کے معاملات میں کسی شخص کو بھی اپنے امیر سے شکایت ہو سکتی ہے کہ امیر نے اس کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ ایسی صورت میں اس آیت میں دیے گئے اصول کو مدنظر رکھنا چاہیے کہ جس شخص کی جو ذمہ داری ہے اس کے بارے میں وہ اللہ کے ہاں جوابدہ ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی ذمہ داری میں کمی یا کوتاہی کرے گا یا کوئی کسی کے ساتھ زیادتی کرے گا تو اللہ کے ہاں ہر کسی کا ٹھیک ٹھیک حساب ہو جائے گا۔ چنانچہ جماعت کے اندر ایک شخص کو کسی شکایت کی صورت میں ناراض ہو کر بیٹھ رہنے کے بجائے یہ سوچنا چاہیے کہ میں اپنی ذمہ داری کی فکر کروں جس کا مجھ سے حساب لیا جانا ہے۔ جہاں تک امیر کی زیادتی کا معاملہ ہے تو اس سلسلے میں وہ خود ہی اللہ کے ہاں جوابدہ ہو گا۔ اسے یہ بھی یقین ہونا چاہیے کہ اللہ کے ہاں ہر کسی کے ساتھ زیادتی کی تلافی بھی کر دی جائے گی۔

اس سورت کی آخری آیات میں جماعتی زندگی سے متعلق بہت اہم ہدایات دی گئی ہیں۔ ان آیات پر مشتمل ایک اہم درس ہمارے ''مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب ۲'' میں شامل ہے۔ ''منتخب نصاب ۲'' کے موضوعات جماعتی زندگی اور اس کے معاملات و مسائل سے ہی متعلق ہیں۔ ظاہر ہے اقامت دین کا کام انفرادی طور پر تو ہو نہیں سکتا۔ اس کے لیے ایک جماعت یا تنظیم کی تشکیل تو بہرحال ناگزیر ہے۔ قرآن نے ایسی جماعت کو ''حزب اللہ'' کا نام دیا ہے اور اس کی کامیابی کی ضمانت بھی دی ہے: ﴿فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝۵۶﴾ (المائدۃ)۔ حدیث میں بھی اس بارے میں يَدُ اللّٰهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ (۲) کی خوشخبری دی گئی ہے کہ جماعت

(۱) یہ حدیث صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی متعدد کتب اور ابواب میں نقل ہوئی ہے۔

(۲) سنن النسائی' کتاب تحریم الدم' باب من فارق الجماعة .....

کے اوپر اللہ کا ہاتھ ہے۔یعنی جماعت کو اللہ تعالیٰ کی تائید اور نصرت حاصل ہے۔

جیسے اقامتِ دین کے لیے جماعت کا قیام ناگزیر ہے اسی طرح جماعت کے لیے نظم اور ڈسپلن بھی ضروری ہے اور ڈسپلن کے لیے قواعد وضوابط کی پابندی بھی لازمی ہے۔ پھر جماعت کے اندر پیدا ہونے والے مسائل کے تدارک اور حل کے لیے کچھ تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ان سب امور سے متعلق راہنمائی کے لیے اگر ہم قرآن سے رجوع کریں تو مختلف مقامات پر ہمیں بڑی عمدہ راہنمائی ملتی ہے۔ ایسے ہی مقامات سے آیات کا انتخاب کر کے منتخب نصاب (۲) مرتب کیا گیا ہے۔☆

﴿وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ۭ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝۵۴﴾ ''اور اگر تم انؐ کی اطاعت پر کاربند رہو گے تو تبھی تم ہدایت یافتہ ہو گے۔ اور (ہمارے) رسولؐ پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے سوائے صاف صاف پہنچا دینے کے۔''

اگلی آیت کو ''آیت استخلاف'' کا نام دیا گیا ہے۔ یہ ایک طویل آیت ہے اور قرآن کی عظیم ترین آیات میں سے ہے۔

آیت ۵۵ ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ ''اللہ کا وعدہ ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں''

یہ وعدہ محض موروثی اور نام کے مسلمانوں کے لیے نہیں ہے' جو اللہ کے احکام کی کلی تعمیل کو اپنا شعار بنانے اور اس کے راستے میں جان و مال کی قربانی دینے کے لیے سنجیدہ نہ ہوں' بلکہ یہ وعدہ تو اُن مؤمنینِ صادقین کے لیے ہے جو ایمان اور عملِ صالح کی شرائط پوری کریں۔ یعنی جو ایمانِ حقیقی کے تمام تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ہر وقت کمربستہ رہتے ہوں۔

﴿لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠﴾ ''کہ وہ ضرور انہیں زمین میں خلافت (غلبہ) عطا کرے گا' جیسے اُس نے ان سے پہلے والوں کو خلافت عطا کی تھی۔''

یعنی اے اُمتِ محمدؐ! اگر تم لوگ ایمانِ حقیقی اور اعمالِ صالحہ کی دو شرائط پوری کرو گے تو

☆ محترم ڈاکٹر صاحبؒ کی تالیف ''حزب اللہ کے اوصاف اور امیر ومأمورین کا باہمی تعلق'' منتخب نصاب (۲) کے دروس پر ہی مشتمل ہے۔ (مرتب)

اللہ تعالیٰ تمہیں زمین میں اسی طرح غلبہ اور اقتدار عطا کرے گا جس طرح اس سے پہلے اس نے حضرت طالوت' حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہم السلام کو خلافت عطا کی تھی یا حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کو مکابی سلطنت کی صورت میں اقتدار عطا کیا تھا۔ اس آیت میں خلافت کے وعدے کو تین مختلف انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اوّل تو یہ تاکیدی وعدہ ہے کہ اللہ لازماً مسلمانوں کو بھی خلافت عطا فرمائے گا جیسے اس نے سابقہ امت کے اہلِ ایمان کو خلافت عطا کی تھی۔ پھر فرمایا:

﴿وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ﴾ ''اور وہ ضرور ان کے اس دین کو غلبہ عطا کرے گا جو اُن کے لیے اُس نے پسند کیا ہے''

اللہ تعالیٰ اپنے پسندیدہ دین کو لازماً غالب کرے گا۔ ظاہر بات ہے کہ جہاں مسلمانوں کی خلافت ہو گی وہاں لازماً اللہ کے دین کا غلبہ ہو گا اور اگر کسی حکومت میں اللہ کا دین غالب ہو گا تو وہ لازماً مسلمانوں ہی کی خلافت ہو گی۔ گویا بنیادی طور پر تو یہ ایک ہی بات ہے' لیکن صرف خلافت کی اہمیت اجاگر کرنے کے لیے پہلی بات کو یہاں دوسرے انداز میں دہرایا گیا ہے۔ البتہ یہاں اس دین کا خصوصی طور پر ذکر کیا گیا ہے جو اللہ نے مسلمانوں کے لیے پسند فرمایا ہے۔ سورۃ المائدۃ کی آیت ۳ میں باقاعدہ نام لے کر بتایا گیا ہے کہ اللہ نے تمہارے لیے دین اسلام کو پسند فرمایا ہے: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۭ﴾ ''آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کی تکمیل فرما دی ہے' اور تم پر اپنی نعمت کا اتمام فرما دیا ہے' اور تمہارے لیے میں نے پسند کر لیا ہے اسلام کو بحیثیت دین کے''۔ بہرحال دوسری بات یہاں یہ بتائی گئی کہ خلافت ملے گی تو اس کے نتیجے کے طور پر اللہ کا دین لازماً غالب ہو گا۔ اور تیسری بات:

﴿وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ﴾ ''اور وہ ان کی (موجودہ) خوف کی حالت کے بعد اس کو لازماً امن سے بدل دے گا۔''

یہ اس کیفیت کی طرف اشارہ ہے جو ہجرت کے فوراً بعد کے زمانے میں مسلمانوں پر طاری تھی۔ اس زمانے میں مدینہ کے اندر مسلسل ایمرجنسی کی سی حالت تھی۔ فلاں قبیلے کی طرف سے حملے کا خطرہ ہے! فلاں قبیلہ جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہے! کل قریش مکہ کی طرف سے ایک خوفناک سازش کی خبر پہنچی تھی! آج ابوعامر راہب کے ایک شیطانی منصوبے کی اطلاع

آن پہنچی ہے! غرض ہجرت کے بعد پانچ سال تک مسلمان مسلسل ایک خوف کی کیفیت میں زندگی بسر کرنے پر مجبور رہے۔ اس صورت حال میں انہیں خوشخبری سنائی جا رہی ہے کہ اب خوف کی وہ کیفیت امن سے بدلنے والی ہے۔

تینوں وعدوں کے بارے میں ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ یہاں بار بار حروفِ تاکید استعمال ہوئے ہیں۔ تینوں افعال میں مضارع سے پہلے لام مفتوح اور بعد میں ''ن'' مشدّد آیا ہے' گویا تینوں وعدے نہایت تاکیدی وعدے ہیں۔

﴿يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ؕ﴾ ''وہ میری ہی عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔''

میرے نزدیک یہ حکم مستقبل سے متعلق ہے۔ یعنی جب میرا دین غالب آ جائے گا تو پھر مسلمان خالص میری بندگی کریں گے اور کسی قسم کا شرک گوارا نہیں کریں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک اللہ کی حکومت قائم نہیں ہوگی تو معاشرہ شرک سے کُلّی طور پر پاک نہیں ہو سکے گا۔ جیسے ہم پاکستان کے مسلمان شہری آج قومی اور اجتماعی اعتبار سے کفر و شرک کے ماحول میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ آج اگر ہم سب انفرادی طور پر اپنے ذاتی عقائد بالکل درست بھی کر لیں اور اپنے آپ کو تمام مشرکانہ اوہام سے پاک کر کے عقیدۂ توحید کو راسخ بھی کر لیں تو بھی ہم خود کو شرک سے کلی طور پر پاک کرنے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ یعنی جب تک ملک میں اللہ کا قانون نافذ اور اللہ کا دین عملی طور پر غالب نہیں ہو جاتا اور جب تک ملک میں دوسرے قوانین کے بجائے اللہ کے قانون کی بالادستی قائم نہیں ہو جاتی اُس وقت تک اس ملک کے شہری ہونے کے اعتبار سے ہم کفر اور شرک کی اجتماعیت میں برابر کے شریک رہیں گے۔ چنانچہ کسی ملک یا علاقے میں عملاً توحید کی تکمیل اُس وقت ہوگی جب اللہ کے فرمان کے مطابق دین کُل کا کُل اللہ کے لیے ہو جائے گا: ﴿وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ؕ﴾ (الانفال: ۳۹)۔

﴿وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝۵۵﴾ ''اور جو اس کے بعد بھی کفر کرے تو ایسے لوگ ہی فاسق ہیں۔''

اس کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ دین کے غلبے کے ماحول میں بھی جو شخص کفر کرے گا تو اس کے اندر گویا خیر کا مادہ سرے سے ہے ہی نہیں۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ باطل کے غلبے میں کسی شخص کا ایمان لانا' اس پر قائم رہنا اور اس کے مطابق عمل کرنا انتہائی مشکل ہے' لیکن جب دین

غالب ہو جائے اور ساری رکاوٹیں دور ہو جائیں تو اس کے بعد صرف وہی شخص دین سے دور رہے گا جس کی فطرت ہی بنیادی طور پر مسخ ہو چکی ہے۔

ان دو مفاہیم کے علاوہ میرے نزدیک اس فقرے کا ایک تیسرا مفہوم بھی ہے اور اس مفہوم کے مطابق ''بَعْدَ ذٰلِكَ'' کے الفاظ کا تعلق مذکورہ تین وعدوں سے ہے' کہ جب اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ وہ لازماً تمہیں خلافت سے نوازے گا' وہ لازماً تمہارے دین کو غالب کرے گا اور وہ لازماً تمہارے خوف کی کیفیت کو امن سے بدل دے گا تو اس کے بعد بھی جو شخص کمرِ ہمت نہ باندھے اور اقامتِ دین کی جِدّوجُہد کے لیے اٹھ کھڑا نہ ہو تو اسے گویا ہمارے وعدوں پر یقین نہیں اور وہ عملی طور پر ہمارے ان احکام سے کفر کا مرتکب ہو رہا ہے!

یہ آیت ۶ ہجری میں نازل ہوئی اور اس کے نزول کے فوراً بعد ہی اس کے مصداق کا ظہور شروع ہو گیا۔ ۷ ہجری میں صلح حدیبیہ طے پا گئی جسے خود اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کے لیے ''فتحِ مبین'' قرار دیا: ﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝۱﴾ (الفتح)۔ صلح حدیبیہ کے فوراً بعد ۷ ہجری میں ہی خیبر فتح ہوا' جس کے نتیجے میں مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے کثرت سے مالِ غنیمت عطا کیا۔ ۸ ہجری میں مکہ فتح ہو گیا۔ ۹ ہجری کو حج کے موقع پر mopping up operation کا اعلان کر دیا گیا۔ اس اعلان کے مطابق آئندہ کے لیے مسجد حرام کے اندر مشرکین کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا گیا۔ جزیرہ نمائے عرب کے تمام مشرکین کو میعادی معاہدوں کی صورت میں اختتامِ معاہدہ تک اور عمومی طور پر چار ماہ کی مہلت دے دی گئی' اور اس کے ساتھ ہی واضح حکم دے دیا گیا کہ اس مدتِ مہلت میں اگر وہ اسلام قبول نہیں کریں گے تو سب کے سب قتل کر دیے جائیں گے۔ یوں ۱۰ ہجری تک جزیرہ نمائے عرب میں اللہ کا دین غالب ہو گیا' اللہ کی حکومت قائم ہو گئی اور حضرت داؤد علیہ السلام کی طرح محمدؐ رسول اللہ ﷺ بھی اللہ کے خلیفہ بن گئے۔

حضور ﷺ کے بعد خلافتِ راشدہ قائم ہوئی اور پھر اس کے بعد رفتہ رفتہ حالات میں بگاڑ آنا شروع ہو گیا جو مسلسل جاری ہے۔ سورۃ الانبیاء کے آخری رکوع کے مطالعہ کے دوران میں نے حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث بیان کی تھی جس میں اُمتِ مسلمہ کے قیامت تک کے حالات کی واضح تفصیل ملتی ہے۔ زیر مطالعہ آیت کے مضمون کے سیاق و سباق میں آپ ﷺ کا یہ فرمان بہت اہم ہے' لہٰذا اہم اس کا ایک بار پھر مطالعہ کر لیتے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ((تَكُوْنُ النُّبُوَّةُ فِيْكُمْ مَا شَاءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُوْنَ)) ''تمہارے درمیان نبوت موجود رہے گی جب تک اللہ چاہے گا کہ وہ رہے''۔ یعنی جب تک اللہ چاہے گا میں بنفسِ نفیس تمہارے

درمیان موجود رہوں گا۔ ((ثُمَّ یَرْفَعُھَا اِذَا شَاءَ اَنْ یَّرْفَعَھَا)) ''پھر اللہ اس کو اٹھا لے گا جب اسے اٹھانا چاہے گا''۔ یعنی جب اللہ چاہے گا میرا انتقال ہو جائے گا اور یوں یہ دور ختم ہو جائے گا۔ ((ثُمَّ تَکُوْنُ خِلَافَۃً عَلٰی مِنْھَاجِ النُّبُوَّۃِ)) ''پھر خلافت ہوگی نبوت کے نقش قدم پر''۔ یعنی میرے قائم کردہ نظام کے مطابق خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے ذریعے یہ نظام ایک بال کے فرق کے بغیر جوں کا توں قائم رہے گا۔ ((فَتَکُوْنُ مَا شَاءَ اللّٰہُ اَنْ تَکُوْنَ)) ''پھر یہ دور بھی رہے گا جب تک اللہ چاہے گا کہ رہے''۔ ((ثُمَّ یَرْفَعُھَا اِذَا شَاءَ اللّٰہُ اَنْ یَّرْفَعَھَا)) ''پھر اس دَور کو بھی اللہ اٹھا لے گا جب اٹھانا چاہے گا''۔ ((ثُمَّ تَکُوْنُ مُلْکًا عَاضًّا)) ''پھر کاٹ کھانے والی ظالم ملوکیت ہوگی''۔ ((فَیَکُوْنُ مَا شَاءَ اللّٰہُ اَنْ یَکُوْنَ)) ''پس یہ دور بھی رہے گا جب تک اللہ چاہے گا'' ((ثُمَّ یَرْفَعُھَا اِذَا شَاءَ اَنْ یَّرْفَعَھَا)) ''پھر اس کو بھی اللہ اٹھا لے گا جب اٹھانا چاہے گا''۔ ((ثُمَّ تَکُوْنُ مُلْکًا جَبْرِیَّۃً)) ''پھر غلامی کی ملوکیت کا دور آئے گا''۔ یہ چوتھا دور ہمارا دور ہے۔ تیسرے دور کی ملوکیت میں سب کے سب حکمران (بنو امیہ' بنو عباس اور ترک بادشاہ) مسلمان تھے۔ ان میں اچھے بھی تھے اور بُرے بھی مگر سب کلمہ گو تھے' جبکہ چوتھے دور کی ملوکیت میں مختلف مسلمان ممالک غیر مسلموں کے غلام ہو گئے۔ کہیں مسلمان تاجِ برطانیہ کی رعایا بن گئے' کہیں ولندیزیوں کے تسلط میں آ گئے اور کہیں فرانسیسیوں کے غلام بن گئے۔ اس طرح پورا عالمِ اسلام غیر مسلموں کے زیر تسلط آ گیا۔

اکیسویں صدی کا موجودہ دور عالم اسلام کے لیے ''مُلْکًا جَبْرِیًّا'' کا ہی تسلسل ہے۔ اگرچہ مسلم ممالک پر سے غیر ملکی قبضہ بظاہر ختم ہو چکا ہے اور ان ممالک پر قابض اقوام کی براہِ راست حکومتوں کی بساط لپیٹ دی گئی ہے لیکن عملی طور پر یہ تمام ممالک اب بھی ان کے قبضے میں ہیں۔ استعماری قوتیں آج بھی ریموٹ کنٹرول اقتدار کے ذریعے ان ممالک کے معاملات سنبھالے ہوئے ہیں۔ ورلڈ بینک' آئی ایم ایف' اور دوسرے بہت سے ادارے ان کے مہروں کے طور پر کام کر رہے ہیں اور یوں وہ اپنے مالیاتی استعمار کو اب بھی قائم رکھے ہوئے ہیں۔

اس کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا کہ یہ چوتھا دور بھی ختم ہو جائے گا: ((ثُمَّ یَرْفَعُھَا اِذَا شَاءَ اَنْ یَّرْفَعَھَا)) ''پھر اللہ اسے بھی اٹھا لے گا جب اٹھانا چاہے گا''۔ اور پھر اُمت کو ایک بہت بڑی خوشخبری دیتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا: ((ثُمَّ تَکُوْنُ خِلَافَۃً عَلٰی مِنْھَاجِ النُّبُوَّۃِ)) ''اس کے بعد پھر خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا دور آئے گا''۔ یہ خوشخبری سنانے کے بعد راوی کہتے ہیں: ثُمَّ سَکَتَ ''پھر رسول اللہ ﷺ خاموش ہو گئے''۔ آپؐ شاید اس لیے خاموش

ہو گئے کہ اس کے بعد دنیا کے خاتمے کا معاملہ تھا۔

اس کے علاوہ ہم حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث بھی پڑھ آئے ہیں جس میں یہ وضاحت بھی ملتی ہے کہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا نظام تمام روئے ارضی کے لیے ہوگا۔ حضرت ثوبانؓ (حضور ﷺ کے آزاد کردہ غلام) روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اِنَّ اللّٰہَ زَوٰی لِیَ الْاَرْضَ)) ''اللہ نے میرے لیے تمام زمین کو لپیٹ دیا۔'' ((فَرَاَیْتُ مَشَارِقَھَا وَمَغَارِبَھَا)) ''تو میں نے اس کے سارے مشرق اور مغرب دیکھ لیے۔'' ((وَاِنَّ اُمَّتِیْ سَیَبْلُغُ مُلْکُھَا مَا زُوِیَ لِیْ مِنْھَا)) ''اور میری اُمت کی حکومت ان تمام علاقوں پر قائم ہوگی جو مجھے دکھائے گئے۔''

اسی طرح ہم نے حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ سے مروی اس حدیث کا مطالعہ بھی کیا تھا جس میں حضور ﷺ نے فرمایا: ''روئے ارضی پر کوئی اینٹ گارے کا بنا ہوا گھر اور کوئی کمبلوں کا بنا ہوا خیمہ ایسا نہیں رہے گا جس میں دین اسلام داخل نہ ہو جائے' خواہ کسی عزت والے کے اعزاز کے ساتھ خواہ کسی مغلوب کی مغلوبیت کی صورت میں''۔ یعنی یا تو اس گھر والا اسلام قبول کر کے اعزاز حاصل کر لے گا یا پھر اسے ذلت کے ساتھ اسلام کی بالادستی قبول کرنا پڑے گی۔ دین کے غلبے کی صورت میں غیر مسلم رعایا کے لیے یہ وہ اصول ہے جو سورۃ التوبہ میں اس طرح بیان ہوا: ﴿حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَۃَ عَنْ یَّدٍ وَّھُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۲۹﴾﴾ یعنی وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔

آنے والے اس دور کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کے ان فرمودات کے ساتھ ساتھ اس معاملے کو منطقی طور پر یوں بھی سمجھ لیجیے کہ قرآن مجید میں تین مقامات (التوبہ: ۳۳' الفتح: ۲۸ اور الصّف: ۹) پر واضح الفاظ میں اعلان فرما دیا گیا ہے: ﴿ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ﴾ ''وہی تو ہے جس نے بھیجا ہے اپنے رسول ﷺ کو الہدیٰ اور دین حق دے کر تا کہ غالب کر دے اسے کُل کے کُل دین (نظامِ زندگی) پر''۔ اس کے علاوہ قرآن حکیم میں پانچ مرتبہ حضور ﷺ کی بعثت کے بارے میں یہ بھی واضح فرما دیا گیا ہے کہ آپؐ کو پوری نوعِ انسانی کے لیے رسول بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اس مضمون میں سورۂ سبا کی یہ آیت بہت واضح اور نمایاں ہے: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَّلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸﴾﴾ ''ہم نے آپؐ کو پوری نوعِ انسانی کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے' لیکن اکثر لوگوں کا اس کا ادراک نہیں ہے''۔ سورۃ الانبیاء میں یہی مضمون ایک نئی شان سے

اس طرح آیا ہے: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾﴾ ''ہم نے تو آپؐ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے''۔ ان دونوں آیات کا مشترک مفہوم یہی ہے کہ حضور ﷺ کی بعثت کا مقصد تب پورا ہوگا جب پورے عالمِ انسانیت پر اللہ کا دین غالب ہوگا۔ چنانچہ قیامت سے پہلے تمام روئے ارضی پر دینِ حق کا غلبہ ایک طے شدہ امر ہے۔

آیت ۵۶ ﴿وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۵۶﴾﴾ ''اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور رسولؐ کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔''

یہاں روئے سخن منافقین کی طرف ہے۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ حضور ﷺ کی شخصی اطاعت والا معاملہ ان پر بہت شاق گزرتا تھا اور ایسے ہر حکم پر وہ بار بار یہی کہتے تھے کہ آپؐ قرآنی آیات کے نزول کے بغیر ہی اپنی اطاعت کے بارے میں احکام جاری کرتے رہتے ہیں!

آیت ۵۷ ﴿لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ﴾ ''ان کافروں کی نسبت یہ گمان نہ کرو کہ وہ زمین میں اللہ کو عاجز کر دیں گے۔''

ان کے متعلق کسی کو یہ غلط فہمی نہ رہے کہ یہ زمین میں اللہ کے قابو سے باہر نکل جائیں گے۔

﴿وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۭ وَلَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۵۷﴾﴾ ''اور ان کا ٹھکانہ آگ ہے اور وہ بہت ہی بُرا ٹھکانہ ہے۔''

آیات ۵۸ تا ۶۱

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا
الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ۭ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ
مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَمِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَاۗءِ ۭ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ ۭ لَيْسَ عَلَيْكُمْ
وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌۢ بَعْدَهُنَّ ۭ طَوّٰفُوْنَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰي بَعْضٍ ۭ كَذٰلِكَ
يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۵۸﴾ وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ
الْحُلُمَ فَلْيَسْتَاْذِنُوْا كَمَا اسْتَاْذَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ
لَكُمْ اٰيٰتِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۵۹﴾ وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَاۗءِ الّٰتِيْ لَا يَرْجُوْنَ
نِكَاحًا فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ يَّضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ غَيْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۢ بِزِيْنَةٍ ۭ

وَاَنْ يَّسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَّهُنَّ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۶۰﴾ لَيْسَ عَلَي الْاَعْمٰى حَرَجٌ
وَّلَا عَلَي الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَي الْمَرِيْضِ حَرَجٌ وَّلَا عَلٰٓي اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا
مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اٰبَاۗىِٕكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اِخْوَانِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ
اَخَوٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ عَمّٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخْوَالِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ
خٰلٰتِكُمْ اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗٓ اَوْ صَدِيْقِكُمْ ۭ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا
جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا ۭ فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ
مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۱﴾

اب سورت کے آخر میں معاشرتی و سماجی معاملات کے بارے میں دوبارہ کچھ ہدایات دی جا رہی ہیں۔ مضامین کی ترتیب کے اعتبار سے اس سورت کی مثال ایک ایسے خوبصورت ہار کی سی ہے جس کے درمیان میں ایک بہت بڑا ہیرا ہے اور اس کے دونوں اطراف میں موتی جڑے ہوئے ہیں۔ سورت کا پانچواں رکوع (جو اس کا وسطی رکوع ہے) اس طرح شروع ہوتا ہے: ﴿اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ۭ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ۭ﴾۔ یہ اس سورت کی آیت ۳۵ ہے جو سورت کے تقریباً وسط میں کوہِ نور ہیرے کی مانند ہے اور اس کے دونوں اطراف میں معاشرتی و سماجی احکام موتیوں کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔ ان میں سے کچھ احکام پہلے چار رکوعات میں ہیں اور کچھ آخری چار رکوعات میں۔

آیت ۵۸ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ﴾ ''اے ایمان والو! چاہیے کہ تم سے اجازت لیا کریں تمہارے غلام اور لونڈیاں''

﴿وَالَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ۭ﴾ ''اور تمہارے وہ بچے بھی جو ابھی بلوغت کی عمر کو نہیں پہنچے تین اوقات میں۔''

دن رات میں تین اوقات تمہاری خلوت (privacy) کے اوقات ہیں۔ ان اوقات میں تمہارے غلام، باندیاں اور بچے بھی بلا اجازت تمہاری خلوت میں مخل نہ ہوں۔ ان اوقات کی تفصیل یہ ہے:

﴿مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ﴾ ''فجر کی نماز سے پہلے، اور جب تم اپنے کپڑے اتار دیتے ہو دوپہر کے وقت''

﴿وَمِنۡۢ بَعۡدِ صَلٰوةِ الۡعِشَآءِ ؕ﴾ ''اور عشاء کی نماز کے بعد۔''

﴿ثَلٰثُ عَوۡرٰتٍ لَّكُمۡ ؕ﴾ ''یہ تین اوقات تمہارے پردے کے ہیں۔''

یعنی یہ تمہاری خلوت (privacy) کے اوقات ہیں۔ ان اوقات میں تمہارے خادموں اور تمہارے بچوں کا اچانک تمہارے پاس آ جانا مناسب نہیں' لہٰذا انہیں یہ ہدایت کر دی جائے کہ وہ ان اوقات میں تمہاری خلوت کی جگہ آنے لگیں تو پہلے اجازت لے لیا کریں۔

﴿لَـيۡسَ عَلَيۡكُمۡ وَلَا عَلَيۡهِمۡ جُنَاحٌۢ بَعۡدَهُنَّ ؕ﴾ ''ان اوقات کے بعد (وہ بلا اجازت آئیں تو) تم پر اور ان پر کوئی حرج نہیں۔''

یعنی ان اوقات کے علاوہ تمہارے غلام' باندیاں یا بچے اگر تمہارے پاس بغیر اجازت آئیں جائیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

﴿طَوَّافُوۡنَ عَلَيۡكُمۡ بَعۡضُكُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ ؕ﴾ ''تم ایک دوسرے کے پاس پھرتے پھراتے ہی رہتے ہو۔''

یعنی گھر کے اندر اِدھر اُدھر مختلف کاموں کے لیے مختلف افراد کو وقتاً فوقتاً آنا جانا ہوتا ہے۔ اس طرح کی آمد و رفت پر ان خاص اوقات کے علاوہ کوئی پابندی نہیں ہے۔

﴿كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الۡاٰيٰتِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ۝۵۸﴾ ''اسی طرح اللہ واضح کرتا ہے تمہارے لیے اپنی آیات۔ اور اللہ علیم ہے' حکیم ہے۔''

آیت ۵۹ ﴿وَاِذَا بَلَغَ الۡاَطۡفَالُ مِنۡكُمُ الۡحُلُمَ فَلۡيَسۡتَاۡذِنُوۡا كَمَا اسۡتَاۡذَنَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ؕ﴾ ''اور جب تمہارے بچے بلوغت کی عمر کو پہنچ جائیں تو چاہیے کہ وہ بھی اجازت لیں جیسے ان سے پہلے لوگ اجازت لیتے ہیں۔''

گھروں میں داخلے کے آداب کے سلسلے میں ایک عمومی حکم اس سے پہلے (اسی سورۃ کی آیت ۲۷ میں) نازل ہو چکا ہے۔ تمہارے بچے جب بالغ ہو جائیں تو وہ بھی اس حکم کی تعمیل کریں۔

﴿كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمۡ اٰيٰتِهٖ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ۝۵۹﴾ ''اس طرح اللہ تمہارے لیے اپنی آیات کی وضاحت کرتا ہے۔ اور اللہ علیم ہے' حکیم ہے۔''

آیت ۶۰ ﴿وَالۡقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِىۡ لَا يَرۡجُوۡنَ نِكَاحًا﴾ ''اور (گھروں میں) بیٹھ رہنے والی عورتیں جو اب نکاح کی امیدوار نہ ہوں''

جن عورتوں کی نکاح کرنے کی عمر نہ رہی ہو اور وہ معمر ہو چکی ہوں۔

﴿فَلَيۡسَ عَلَيۡهِنَّ جُنَاحٌ اَنۡ يَّضَعۡنَ ثِيَابَهُنَّ﴾ ''تو ان پر کوئی حرج نہیں اگر وہ اپنے (اضافی) کپڑے اتار دیا کریں''

یعنی ایسی عورتوں کے لیے ضروری نہیں کہ وہ بڑی چادر ہی اوڑھ کر گھر سے باہر نکلیں۔ اسی طرح گھر کے اندر بیٹھے ہوئے ان پر جوان عورتوں کی طرح ہر وقت دوپٹے اوڑھے رکھنے کی پابندی نہیں ہے۔

﴿غَيۡرَ مُتَبَرِّجٰتٍۭ بِزِيۡنَةٍ ؕ﴾ ''بشرطیکہ زینت کی نمائش کرنے والی نہ ہوں۔''

اپنی چادریں اتار کر رکھ دینے سے ان کی نیت دوسروں پر اپنی زینت ظاہر کرنے کی نہ ہو اور نہ وہ بظاہر ایسا کریں۔

﴿وَاَنۡ يَّسۡتَعۡفِفۡنَ خَيۡرٌ لَّهُنَّ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ۝۶۰﴾ ''اور اگر وہ اس معاملے میں احتیاط ہی کریں تو یہ ان کے لیے بہتر ہے۔ اور اللہ سب کچھ سننے والا' ہر چیز کا جاننے والا ہے۔''

ان کے سن رسیدہ ہونے کی وجہ سے انہیں جو رعایت دی جا رہی ہے اگر وہ اس رعایت سے فائدہ نہ اٹھائیں اور اپنے کپڑوں کے بارے میں حتی الوسع احتیاط ہی کریں تو یہ ان کے لیے بہتر ہے' کیونکہ شیطان تو ہر وقت انسان کی تاک میں رہتا ہے۔ کیا خبر کس وقت وہ کوئی فتنہ کھڑا کر دے۔

آیت ۶۱ ﴿لَيۡسَ عَلَى الۡاَعۡمٰى حَرَجٌ﴾ ''کسی اندھے پر کوئی تنگی نہیں''

یہاں پر اس سوال کا جواب دیا جا رہا ہے کہ اگر کسی خاندان' گھر یا برادری میں کوئی معذور شخص ہو جو معذوری کے سبب اپنی آزاد معاش کا اہل نہ ہو تو ایسے شخص کے لیے شریعت کی ان پابندیوں کے بارے میں کیا حکم ہوگا؟ چنانچہ ایسے لوگوں کے بارے میں یہاں واضح طور پر بتا دیا گیا کہ اگر وہ تمہارے گھروں میں رہیں تو اس میں مضائقہ نہیں۔

﴿وَّلَا عَلَى الۡاَعۡرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الۡمَرِيۡضِ حَرَجٌ وَّلَا عَلٰٓى اَنۡفُسِكُمۡ﴾ ''اور نہ کسی لنگڑے پر کوئی تنگی ہے اور نہ کسی مریض پر کوئی تنگی ہے' اور نہ خود تمہارے اپنے اوپر (اس ضمن میں) کوئی تنگی ہے''

﴿اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اٰبَآئِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اِخْوَانِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخَوٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ عَمّٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخْوَالِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ خٰلٰتِكُمْ﴾ ''کہ تم کھانا کھایا کرو اپنے گھروں سے' یا اپنے باپوں کے گھروں سے' یا اپنی ماؤں کے گھروں سے' یا اپنے بھائیوں کے گھروں سے' یا اپنی بہنوں کے گھروں سے' یا اپنے چچاؤں کے گھروں سے' یا اپنی پھوپھیوں کے گھروں سے' یا اپنے ماموؤں کے گھروں سے' یا اپنی خالاؤں کے گھروں سے''

﴿اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗٓ اَوْ صَدِيْقِكُمْ ؕ﴾ ''یا (ایسے گھروں سے) جن کی چابیاں تمہارے پاس ہوں یا اپنے دوستوں کے گھروں سے۔''

جیسے کوئی کارخانہ ہو اور اس کے مالک کے پاس اس کی چابیاں ہوں' وہ جب چاہے وہاں جائے اور بیٹھ کر کھائے پیئے۔

﴿لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا ؕ﴾ ''تمہارے اوپر کوئی حرج نہیں کہ تم سب مل کر کھاؤ یا الگ الگ۔''

بعض لوگوں نے ان الفاظ سے خواہ مخواہ یہ مفہوم نکالنے کی کوشش کی ہے کہ یہاں مَردوں اور عورتوں کو اکٹھے کھانے کی اجازت دی گئی ہے۔ دراصل یہ مجلسی احکام ہیں اور خصوصی طور پر اس حکم میں ایسی صورت حال مراد ہے جس میں کچھ لوگ کھانے کی جگہ پر پہنچ جاتے ہیں جبکہ بعض دوسرے لوگ ابھی نہیں پہنچتے اور پہلے آنے والوں کو اس سے سخت تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے ایسی صورت میں اجازت دی گئی ہے کہ جیسے سہولت ہو ویسے کھا پی لیا جائے' سب کا اکٹھے کھانا ہی ضروری نہیں ہے۔ الگ الگ گروہوں میں بھی کھانا کھایا جا سکتا ہے اور الگ الگ افراد بھی کھا سکتے ہیں۔ اس میں خواہ مخواہ تکلف یا تکلیف کی ضرورت نہیں ہے۔ ان مجلسی احکام سے ایسا مفہوم نکالنے کی کوشش کرنا سراسر زیادتی ہے کہ یہاں ستر و حجاب کے احکام بھی نعوذ باللہ معطل کر دیے گئے ہیں اور کھانے پینے کی مخلوط پارٹیوں کی اجازت دے دی گئی ہے۔ معاذ اللہ!

﴿فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ﴾ ''تو جب تم گھروں میں داخل ہو تو اپنے (لوگوں) پر سلام بھیجا کرو''

یعنی جس گھر میں تم بطور مہمان جا رہے ہو اس میں موجود لوگ تمہارے اپنے ہی لوگ ہیں'

وہ تمہارے عزیز اور رشتہ دار ہیں۔ چنانچہ تم اپنے ان لوگوں کو ضرور ''السلام علیکم'' کہا کرو۔ خود اپنے گھر میں بھی داخل ہو تو ''السلام علیکم'' کہا کرو۔

﴿تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً ؕ﴾ ''یہ دعا ہے اللہ کی طرف سے مبارک بھی اور پاک بھی''

''السلام علیکم'' ایک ایسی بابرکت اور پاکیزہ دعا ہے جو ایسے مواقع کے لیے اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کو خصوصی طور پر سکھائی ہے۔

﴿كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿٦١﴾﴾ ''اسی طرح اللہ تمہارے لیے اپنی آیات واضح کر رہا ہے تاکہ تم لوگ عقل سے کام لو۔''

آیات ۶۲ تا ۶۴

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٦٢﴾ لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ؕ قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا ۚ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٦٣﴾ اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قَدْ يَعْلَمُ مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ ؕ وَيَوْمَ يُرْجَعُوْنَ اِلَيْهِ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿٦٤﴾

آخری رکوع جو صرف تین آیات پر مشتمل ہے' اس میں خالص جماعتی زندگی سے متعلق احکام ہیں۔

آیت ۶۲ ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ ''مؤمن تو صرف وہی ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اُس کے رسولؐ پر''

﴿وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ ؕ﴾ ''اور جب وہ کسی اجتماعی کام کے ضمن میں رسولؐ کے ساتھ ہوتے ہیں تو وہاں سے جاتے نہیں جب

تک کہ انؐ سے اجازت نہ لے لیں۔‘‘

نبی مکرم ﷺ کے بعد یہی حکم آپؐ کے جانشینوں اور اسلامی نظم جماعت کے امراء کے لیے ہے۔ اس حکم کے تحت کسی جماعت کے تمام ارکان کو ایک نظم (discipline) کا پابند کر دیا گیا ہے۔ اگر ایسا نظم وضبط اس جماعت کے اندر نہیں ہوگا تو کسی کام یا مہم پر جاتے ہوئے کوئی شخص ادھر کھسک جائے گا‘ کوئی اُدھر چلا جائے گا۔ ایسی صورت حال میں کوئی بھی اجتماعی کام پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔ چنانچہ اس حکم کے تحت لازمی قرار دے دیا گیا کہ کسی مجبوری یا عذر وغیرہ کی صورت میں اگر کوئی رخصت چاہتا ہو تو موقع پر موجود امیر سے باقاعدہ اجازت لے کر جائے۔

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ﴾ ’’یقیناً جو لوگ آپؐ سے اجازت طلب کرتے ہیں وہی ہیں جو ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر۔‘‘

﴿فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ﴾ ’’پھر جب وہ آپؐ سے اجازت مانگیں اپنے کسی عذر کی وجہ سے تو آپؐ ان میں سے جس کو چاہیں اجازت دے دیجیے‘‘

رخصت دینے کا اختیار تو آپؐ ہی کے پاس ہے۔ یعنی اسلامی نظم جماعت کے لیے یہ اصول دے دیا گیا کہ اجتماعی معاملات میں رخصت دینے کا اختیار امیر کے پاس ہے۔ چنانچہ امیر یا کمانڈر اپنے مشن کی ضرورت اور درپیش صورت حال کو دیکھتے ہوئے اگر مناسب سمجھے تو رخصت مانگنے والے کو اجازت دے دے اور اگر مناسب نہ سمجھے تو اجازت نہ دے۔ چنانچہ کوئی بھی ماتحت یا مامور شخص اجازت مانگنے کے بعد رخصت کو اپنا لازمی استحقاق نہ سمجھے۔

﴿وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ ؕ﴾ ’’اور ان کے لیے اللہ سے استغفار کیجیے۔‘‘

اس لیے کہ وہ اجتماعی کام جس کے لیے حضور ﷺ اہل ایمان کی جماعت کو ساتھ لے کر نکلے ہیں‘ آپؐ کا ذاتی کام نہیں بلکہ دین کا کام ہے۔ اب اگر اس دین کے کام سے کوئی شخص رخصت طلب کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنے ذاتی کام کو دین کے کام پر ترجیح دی ہے اور ذاتی کام کے مقابلے میں دین کے کام کو کم اہم سمجھا ہے۔ بظاہر یہ ایک بہت سنجیدہ معاملہ اور نازک صورت حال ہے‘ اس لیے فرمایا جا رہا ہے کہ ایسے لوگوں کے لیے اللہ سے مغفرت کی دعا کریں۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۶۲﴾﴾ ’’یقیناً اللہ بہت بخشنے والا‘ بہت رحم کرنے والا ہے۔‘‘

یہاں یہ نکتہ نوٹ کیجیے کہ یہی مضمون سورۃ التوبہ میں بھی آیا ہے‘ لیکن وہاں اس کی نوعیت بالکل مختلف ہے۔ اس فرق کو یوں سمجھئے کہ سورۃ النور ۶ ہجری میں نازل ہوئی تھی‘ جبکہ سورۃ التوبہ ۹ ہجری میں۔ اسلامی تحریک لمحہ بہ لمحہ اپنے ہدف کی طرف آگے بڑھ رہی تھی۔ حالات بتدریج تبدیل ہو رہے تھے اور حالات کے بدلنے سے تقاضے بھی بدلتے رہتے تھے۔ چنانچہ یہاں (۶ ہجری) فرمایا جا رہا ہے کہ جو لوگ آپؐ سے باقاعدہ اجازت طلب کرتے ہیں وہ واقعی ایمان والے ہیں‘ جبکہ تین سال بعد سورۃ التوبہ میں غزوۂ تبوک کے موقع پر فرمایا گیا کہ جو ایمان رکھتے ہیں وہ اجازت لیتے ہی نہیں۔ دراصل وہ ایمرجنسی کا موقع تھا اور اس موقع پر غزوۂ تبوک کے لیے نکلنا ہر مسلمان کے لیے لازم کر دیا گیا تھا۔ ایسے موقع پر کسی شخص کا رخصت طلب کرنا ہی اس بات کی علامت تھی کہ وہ شخص منافق ہے۔ چنانچہ وہاں (سورۃ التوبہ میں) رخصت دینے سے منع فرمایا گیا:

﴿عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ﴾ (آیت ۴۳) ’’اللہ آپؐ کو معاف فرمائے (یا اللہ نے آپؐ کو معاف فرما دیا) آپؐ نے ایسے لوگوں کو کیوں اجازت دے دی؟‘‘ اگر آپؐ اجازت نہ بھی دیتے تو یہ لوگ پھر بھی نہ جاتے لیکن اس سے ان کے نفاق کا پردہ تو چاک ہو جاتا! اس کے برعکس یہاں حضور ﷺ کو اختیار دیا جا رہا ہے کہ آپؐ جسے چاہیں رخصت دے دیں۔

اس مضمون کو ایک دوسرے زاویے سے دیکھیں تو ایسے مواقع پر کسی اسلامی جماعت کے افراد کے درمیان ہمیں تین سطحوں پر درجہ بندی ہوتی نظر آتی ہے۔ پہلا درجہ ان ارکان کا ہے جو اپنے آپ کو دین کے کام کے لیے ہمہ تن وقف کر چکے ہیں۔ ان کے لیے دنیا کا کوئی کام اس کام سے زیادہ اہم اور ضروری نہیں ہے۔ لہٰذا ان کے رخصت لینے کا کوئی موقع ومحل ہے ہی نہیں۔ اس سے نچلا درجہ ان ارکان کا ہے جو ایسے مواقع پر کسی ذاتی مجبوری اور ضرورت کے تحت باقاعدہ اجازت لے کر رخصت لیتے ہیں‘ جبکہ اس سے نچلے درجے پر وہ لوگ ہیں جو اجازت کے بغیر ہی کھسک جاتے ہیں۔ گویا ان کا دین کے اس کام سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ اس درجہ بندی میں اوپر والے زینے کے اعتبار سے اگرچہ درمیان والا زینہ کم تر درجے میں ہے لیکن نچلے زینے کے مقابلے میں بہرحال وہ بھی بہتر ہے۔

یہ بات ہمارے مشاہدے میں ہے کہ اسلامی جماعتوں کے اجتماعات کے موقع پر بعض رفقاء نہ تو اجتماع میں شامل ہوتے ہیں اور نہ ہی اپنے نظم سے رخصت لیتے ہیں۔ نہ وہ پہلے

بتاتے ہیں نہ ہی بعد میں معذرت کرتے ہیں۔ گویا انہیں کوئی احساس ہی نہیں' نہ نظم کی پابندی کا اور نہ اپنی ذمہ داری کا۔ ان سے وہ رفقاء یقیناً بہتر ہیں جو اپنا عذر پیش کر کے اپنے امیر سے باقاعدہ رخصت لیتے ہیں۔ لیکن ان سب درجات میں سب سے اونچا درجہ بہرحال یہی ہے کہ دین کے کام کے مقابلے میں دنیا کے کسی کام کو ترجیح نہ دی جائے۔ اس درجے پر فائز لوگوں کے ذاتی کام اللہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے کاموں کو پس پشت ڈال کر اللہ کے کام کے لیے نکلتے ہیں تو ان کے کاموں کو اللہ خود سنوارتا ہے۔

آیت ۶۳ ﴿لَا تَجۡعَلُوۡا دُعَآءَ الرَّسُوۡلِ بَيۡنَكُمۡ كَدُعَآءِ بَعۡضِكُمۡ بَعۡضًا ؕ﴾ ''تم لوگ رسولؐ کے بلانے کو ایسے نہ سمجھ لو جیسے تمہارا آپس میں ایک دوسرے کو بلانا۔''

یعنی رسول اللہ ﷺ کا بلاوا غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ کسی دوسرے شخص کے بلانے پر تم نہ جاؤ تو کوئی بڑی بات نہیں' لیکن رسولؐ کے بلانے پر تم لبیک نہ کہو تو اپنے ایمان کی خیر مناؤ۔ اب ایک بلانا یہ بھی ہے کہ کسی شخص کو اس کے کسی دوست نے اپنے گھر کھانے کی دعوت دی اور دوسری طرف رسول اللہ ﷺ نے بھی کسی کو اپنے ہاں کھانے کی دعوت دی۔ ایسی صورت میں رسول اللہ ﷺ کی دعوت کہاں اور ایک عام آدمی کی دعوت کہاں! —— لیکن ایک بلانا اللہ کے رستے میں جہاد کے لیے بلانا ہے کہ ایک طرف رسول اللہ ﷺ لوگوں کو بلا رہے ہیں کہ آؤ اللہ کی راہ میں میرے ساتھ چلو اور دوسری طرف کوئی عام شخص کسی دوسرے شخص کو اپنی مدد کے لیے بلا رہا ہے تو رسول اللہ ﷺ کے بلانے اور ایک عام آدمی کے بلانے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

''دُعَآءَ الرَّسُوۡلِ'' کا ایک مفہوم ''رسولؐ کو پکارنا'' بھی ہے۔ یعنی جیسے تم لوگ آپس میں ایک دوسرے کو مخاطب کرتے ہو' رسول اللہ ﷺ کو تم ایسے مخاطب نہیں کر سکتے۔ آپؐ کے ادب اور احترام کے بارے میں سورۃ الحجرات میں بہت واضح ہدایات دی گئی ہیں: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَرۡفَعُوۡۤا اَصۡوَاتَكُمۡ فَوۡقَ صَوۡتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجۡهَرُوۡا لَهٗ بِالۡقَوۡلِ كَجَهۡرِ بَعۡضِكُمۡ لِبَعۡضٍ اَنۡ تَحۡبَطَ اَعۡمَالُكُمۡ وَاَنۡتُمۡ لَا تَشۡعُرُوۡنَ ۝۲﴾ ''اے ایمان والو! اپنی آوازیں نبی ﷺ کی آواز پر بلند نہ کرو اور نہ آپؐ سے اونچی آواز میں بات کرو جیسے تم ایک دوسرے سے اونچی آواز میں بات کرتے ہو' کہیں تمہارے سارے اعمال برباد نہ ہو جائیں اور تمہیں پتا بھی نہ چلے''۔ سورۃ الحجرات کے مطالعہ کے دوران اس بارے میں مزید تفصیل سے بات ہو گی۔

﴿قَدۡ یَعۡلَمُ اللّٰهُ الَّذِیۡنَ یَتَسَلَّلُوۡنَ مِنۡكُمۡ لِوَاذًا ۚ﴾ ''اللہ خوب جانتا ہے تم میں سے ان لوگوں کو جو ایک دوسرے کی اوٹ لے کر کھسک جاتے ہیں۔''

یہ ایسے لوگوں کا ذکر ہے جن کی نیت میں پہلے سے ہی فتور ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کا معاملہ یوں ہوتا ہے کہ جب لوگ کسی مہم کے لیے نکلے تو یہ بھی نکل پڑے۔ پھر جب دیکھا کہ ان کا نام جانے والوں میں شامل ہو چکا ہے تو اس کے بعد آنکھ بچا کر چپکے سے ایک دوسرے کی آڑ لیتے ہوئے کھسک گئے۔ یا اس کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کسی اجتماع میں شریک ہوئے' وہاں اچانک کسی مہم کے لیے کچھ رضا کاروں کی ضرورت پڑ گئی تو اب اس سے پہلے کہ رضا کاروں کے نام پوچھنے کا مرحلہ آتا' یہ آنکھ بچا کر وہاں سے کھسک گئے۔

﴿فَلۡیَحۡذَرِ الَّذِیۡنَ یُخَالِفُوۡنَ عَنۡ اَمۡرِهٖۤ اَنۡ تُصِیۡبَهُمۡ فِتۡنَةٌ اَوۡ یُصِیۡبَهُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ۝۶۳﴾ ''تو جو لوگ رسولؐ کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں انہیں ڈرنا چاہیے کہ ان پر کوئی آزمائش آ جائے یا ان کو کوئی دردناک عذاب آ پکڑے۔''

آیت ۶۴ ﴿اَلَاۤ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ قَدۡ یَعۡلَمُ مَاۤ اَنۡتُمۡ عَلَیۡهِ ؕ﴾ ''آگاہ ہو جاؤ! یقیناً اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے۔ وہ خوب جانتا ہے تم جس حال پر ہو۔''

اللہ کو خوب معلوم ہے کہ تم ایمان و یقین کے حوالے سے کس مقام پر کھڑے ہو۔ وہ تمہارے ایمان کی کیفیت' نیت کے اخلاص اور عمل کی تڑپ کو بہت اچھی طرح جانتا ہے۔

﴿وَیَوۡمَ یُرۡجَعُوۡنَ اِلَیۡهِ فَیُنَبِّئُهُمۡ بِمَا عَمِلُوۡا ؕ﴾ ''اور جس دن یہ لوگ لوٹائے جائیں گے اُس کی طرف تو وہ انہیں جتلا دے گا جو کچھ بھی عمل انہوں نے کیے ہوں گے۔''

﴿وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ۝۶۴﴾ ''اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔''

بارك اللّٰه لى ولكم فى القرآن العظيم ونفعنى وايّاكم بالآيات والذّكر الحكيم○○

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر
''بیان القرآن'' کے ترجمہ و ترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں'
آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ!)

اطاعتِ رسولؐ، ایمان کی علامت ہے

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

۱۵/اگست ۲۰۰۸ء کا خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ؕ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ﴿۴۳﴾﴾ (الفرقان)

﴿اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۳﴾﴾ (الجاثیہ)

﴿فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ﴿۳۷﴾ وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۳۸﴾ فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿۳۹﴾ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ﴿۴۰﴾ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿۴۱﴾﴾ (النّٰزعٰت)

عَنْ اَبِیْ مُحَمَّدٍ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو ابْنِ الْعَاصِ رضی اللہ عنہما قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:

((لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ))(۱)

سیدنا ابومحمدؐ عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''تم میں سے کوئی بھی اُس وقت تک حقیقی مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کی دلی خواہشات اس (شریعت اور دین) کے تابع نہ ہو جائیں جو میں لایا ہوں!''

معزز سامعین کرام!

آج ہم اربعین نووی کی حدیث ۴۱ کا مطالعہ کر رہے ہیں — جہاں تک ''اربعین'' کے نام کا تعلق ہے تو اُس اعتبار سے چالیسویں حدیث ہم گزشتہ جمعہ پڑھ چکے ہیں، گویا

(۱) رواہ فی "شرح السنة" وقال النووی فی "الاربعین" رویناہ فی "کتاب الحجة" باسناد صحیح۔ مشکاة المصابیح، کتاب الایمان، باب الاعتصام بالکتاب والسنة، الفصل الثانی

''اربعین'' کی تکمیل ہو چکی ہے، لیکن امام نوویؒ نے اس مجموعہ احادیث میں خود ہی دو حدیثوں کا اضافہ کیا ہے اور ان دو میں سے پہلی آج ہمارے زیر مطالعہ ہے۔

عبادلۂ اربعہ رضی اللہ عنہم اور ان کا خاص طبعی رُجحان

یہ حدیث حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ یہاں میں معلوماتِ عامہ اور عمومی دلچسپی کے اعتبار سے یہ بتانا چاہوں گا کہ صحابہ کرامؓ کی دوسری نسل میں عبادلہ اربعہؓ بہت مشہور ہیں — دیکھئے ایک نسل میں تو حضور اکرم ﷺ کے قریباً ہم عمر صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ہیں، مثلاً حضرات ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم، جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ دوسری نسل میں آئیں گے، اس لیے کہ جب ایمان لائے تو آپؓ کی عمر ۱۳ برس تھی اور حضور ﷺ کے انتقال کے وقت ۳۰ برس کے لگ بھگ تھے۔ اس دوسری نسل میں پھر ذرا اور چھوٹے صحابہ بھی ہیں اور ان میں ''عبادلہ اربعہ'' بہت مشہور ہیں، جن میں سے ہر ایک کا اپنا ایک خاص طبعیر جحان اور خاص میدان ہے۔

(۱) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما: آپ حضور ﷺ کے چچا زاد بھائی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے بیٹے ہیں اور آپ کا خاص طبعی رجحان قرآن مجید کی تفسیر اور تاویل کی طرف تھا۔ انہی کے بارے میں حضور ﷺ نے دعا کی تھی: ((اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ وَعَلِّمْهُ التَّاْوِيْلَ))(۱) ''اے اللہ! اس نوجوان کو دین کا فہم اور قرآن کی تاویل سکھا دے''۔ ایک ہے علم اور ایک ہے فہم۔ ہوسکتا ہے کسی کے پاس ٹنوں علم ہو، لیکن اس میں فہم نہ ہو، اور ہوسکتا ہے کہ وہ شخص اپنے علم سے کسی کو فائدہ نہ پہنچا رہا ہو، بلکہ اُلٹا دوسروں کو نقصان پہنچا سکتا ہو۔ چنانچہ اللہ کے رسول ﷺ نے فہم کی اسی اہمیت کو مدِنظر رکھتے ہوئے اس نوجوان صحابی کے لیے فہم فی الدین کی دعا فرمائی۔

(۲) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما: عبادلہ اربعہ میں سے دوسرے ہیں حضرت عبداللہ بن عمرؓ۔ یہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بیٹے ہیں اور ان کا خاص وصف تھا اتباعِ سنّت، بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کے اندر غلو کی حد تک اتباعِ سنّت کا جذبہ تھا۔ اس کا اندازہ اس

(۱) مسند احمد، کتاب ومن مسند بنی هاشم، باب بداية مسند عبدالله بن العباس۔

بات سے لگائیے کہ حضور اکرم ﷺ کی وفات کے بعد جب آپؓ دوبارہ حج کرنے گئے تو انہوں نے حضور ﷺ کے ہر ہر طریقے کی پیروی کی۔ مثلاً حجۃ الوداع کے موقع پر حضور اکرم ﷺ نے جہاں جہاں قیام کیا‘ جہاں کسی درخت کے سائے میں آرام کیا‘ اور جس راستے سے ہو کر گزرے تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے بھی بعینہٖ اسی طرح آپ ﷺ کے نقش قدم کی پیروی کی‘ انہی مقامات پر قیام کیا‘ انہی درختوں کے نیچے سے ہو کر گزرے۔ میں کہوں گا کہ یہ اصل میں مجذوب ہونے کی حد تک اتباعِ سنت کا جذبہ ہے‘ جو حضور ﷺ کی محبت کی وجہ سے ہے۔ میں نے پہلے بھی آپ کو یہ واقعہ سنایا ہے کہ ایک بدوی صحابی حضور ﷺ سے ملنے کے لیے آئے تو اُس وقت اتفاقاً حضور ﷺ نے اپنی قمیص کے بٹن بند نہیں کر رکھے تھے۔ اُن بدوی صحابی نے آپ ﷺ کو اس طرح دیکھا تو پھر ساری عمر بٹن بند نہیں کیے۔ ہم کہیں گے کہ یہ محبتِ رسولؐ کی وجہ سے اتباع کا جذبہ تھا۔ بہرحال حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا خاص وصف اور خاص رجحان اتباعِ رسولؐ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں اہل حدیث مکتب فکر کو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔

(۳) حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما: عبادلہ اربعہ میں سے تیسرے عبداللہ بن زبیرؓ ہیں۔ ان کا کوئی خاص علمی وصف نمایاں نہیں ہے‘ لیکن شجاعت اور بہادری کے اندر ان کا بڑا اونچا مقام ہے۔ چنانچہ یزید کی بیعت سے جن حضرات نے انکار کیا‘ ان میں یہ بھی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ شامل تھے۔ اُس وقت تین عبادلہ عبداللہ بن عباس‘ عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم موجود تھے۔ عبداللہ بن عباسؓ اور عبداللہ بن عمرؓ دونوں کی رائے یہ تھی کہ اگرچہ یہ کام غلط ہوا ہے‘ لیکن ایسا نہیں ہے کہ اس کی بنا پر فتنہ و فساد پیدا کر دیا جائے۔ ان کے پیش نظر یہ تھا کہ اگر بغاوت کریں گے تو مسلمانوں میں خانہ جنگی ہوگی‘ انتشار پیدا ہوگا‘ جبکہ ساڑھے چار سال کی خانہ جنگی مسلمان پہلے ہی بھگت چکے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت تک بلکہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت سے دستبرداری تک مسلمانوں میں مسلسل خانہ جنگی رہی اور اس میں

ایک لاکھ کے قریب مسلمان ایک دوسرے کی تلواروں‘ نیزوں اور تیروں سے ہلاک ہوئے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے مصلحت کو پیش نظر رکھا کہ اگرچہ کام غلط ہے لیکن ایسا غلط بھی نہیں ہے کہ کفر ہو‘ جس کے خلاف کھڑے ہو جانا فرض ہو جائے۔

بہرحال ان تین عبادلہ میں سے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ ڈٹ گئے کہ ہاں یہ غلط بھی ہے اور ہمیں اس کے خلاف مزاحمت بھی کرنا ہے‘ چاہے کچھ بھی ہو۔ پھر حضرت حسینؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ میں اس حوالے سے اختلاف پیدا ہوا۔ حضرت حسینؓ کو چونکہ اہلِ کوفہ کی طرف سے خطوط آ رہے تھے تو وہ کوفہ چلے گئے‘ جبکہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی رائے یہ تھی کہ حجاز ہی میں مقیم رہ کر مزاحمت کی جائے‘ اس لیے کہ یہاں پر ہمارا حلقۂ اثر مضبوط ہے۔ وقت نے ثابت کیا کہ ان کی رائے زیادہ صحیح تھی‘ اس لیے کہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے حجاز میں حکومت قائم کی اور پھر ان کی حکومت چھ سال تک قائم بھی رہی۔ دوسری طرف حضرت حسینؓ حکومت قائم نہیں کر سکے‘ بلکہ انتہائی مظلومی کی حالت میں کربلا میں شہید ہو گئے۔

(۴) حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما: عبادلہ اربعہ میں سے چوتھے عبداللہ ابن عمرو بن العاصؓ ہیں — واضح رہے کہ ’’عَمرو‘‘ عین کی زبر کے ساتھ ہے جبکہ واؤ ساکت (silent) ہے — حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کا خاص وصف زہد اور عبادت ہے‘ بلکہ یوں سمجھئے کہ اس میں غلو کی حد تک پہنچے ہوئے ہیں۔ چنانچہ انہی کے بارے میں وہ واقعہ آتا ہے کہ حضور ﷺ کو کسی نے اطلاع دی کہ عبداللہ تو ہر روز روزہ رکھتا ہے اور ساری رات عبادت کے لیے کھڑا رہتا ہے۔ حضور ﷺ نے طلب فرمایا اور پوچھا: ((اَلَمْ اُخْبَرْ اَنَّكَ تَقُوْمُ اللَّيْلَ وَتَصُوْمُ النَّهَارَ؟)) ’’کیا مجھے یہ خبر نہیں ملی کہ تم رات بھر قیام کرتے ہو اور روزانہ دن کو روزہ رکھتے ہو؟‘‘ انہوں نے عرض کیا: جی ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا: ((فَلَا تَفْعَلْ، قُمْ وَنَمْ، وَصُمْ وَاَفْطِرْ، فَاِنَّ لِجَسَدِكَ عَلَيْكَ حَقًّا، وَاِنَّ لِعَيْنِكَ عَلَيْكَ حَقًّا، وَاِنَّ لِزَوْرِكَ عَلَيْكَ حَقًّا، وَاِنَّ لِزَوْجِكَ عَلَيْكَ

حَقًّا.....))[1] ''تو ایسا مت کرو' (رات کو) قیام بھی کیا کرو اور سویا بھی کرو' اور (نفلی) روزے رکھا بھی کرو اور چھوڑ بھی دیا کرو' اس لیے کہ تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے' تمہاری آنکھ (نیند) کا بھی تم پر حق ہے' تمہارے ملاقاتی کا بھی تم پر حق ہے۔ اور تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے.....''

بہرحال ان کا خاص وصف زہد اور عبادت ہے۔ ایک خاص قابل ذکر تضاد (contrast) یہ ہے کہ ان کے والد عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بہادری' شجاعت' موقع شناسی' سیاست اور ڈپلومیسی میں بہت مشہور ہیں — ڈپلومیسی دراصل وقت کی نزاکت اور مصلحت کو سمجھنے اور دور اندیشی کے ساتھ معاملہ کرنے کا نام ہے۔ آج کل ڈپلومیسی کا مفہوم غلط سمجھا جاتا ہے اور آج منافقت کا نام ڈپلومیسی ہوگیا ہے' لیکن ڈپلومیسی کا اصل مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسان سیاست کے رموز سے واقف ہو' حالات کا بھی صحیح اندازہ کر سکے اور صحیح وقت پر صحیح فیصلے تک پہنچے — بہرحال حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ شجاعت اور سیاست میں مشہور ہیں جبکہ ان کے بیٹے عبداللہ انتہائی زاہد و عابد ہیں۔ انہیں تو دنیا سے کوئی سروکار ہی نہیں' تو ان کی سیاست سے کیا دلچسپی ہوگی؟ تو یہ تضاد ہے جو باپ اور بیٹے کے درمیان ہے۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ عرب کے ایک بڑے مدبر اور سیاست دان مانے جاتے تھے' یہی وجہ ہے کہ جب مسلمان ہجرت کر کے حبشہ میں پناہ گزین ہو گئے تھے تو ان کو واپس لانے کے لیے سردارانِ مکہ نے عمرو بن العاص کو ہی نجاشی کے دربار میں اپنا سفیر بنا کر بھیجا تھا۔ انہوں نے نجاشی کے دربار میں جا کر کہا کہ ہمارے کچھ بھگوڑے آپ کے ہاں آ گئے ہیں اور انہوں نے آپ کے علاقے میں پناہ لے لی ہے' آپ انہیں واپس کر دیں۔ عمرو بن العاص نے اس کی مذہبی عصبیت کی رگ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا کہ یہ حضرت عیسیٰؑ کو انسان مانتے ہیں اور تم انہیں خدا کا بیٹا کہتے ہو۔ اب نجاشی نے صرف ان کی بات سن کر فیصلہ نہیں کیا بلکہ انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس نے

(۱) صحیح البخاری' کتاب النکاح' باب لزوجك عليك حق۔

مسلمانوں کے وفد کو بلایا اور پوچھا کہ حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں تمہارا کیا موقف ہے؟ اس پر حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ نے سورۂ مریم کا دوسرا رکوع پڑھ کر سنایا تو وہ اس قدر متاثر ہوا کہ اپنے تخت سے نیچے اُترا اور زمین سے ایک تنکا اٹھا کر کہا کہ جو کچھ ان آیات میں حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں کہا گیا ہے' آپؑ اس سے ایک تنکا بھر بھی زائد نہیں ہیں۔ نجاشی قرآن کی حقانیت اور حضرت محمد ﷺ کی رسالت پر ایمان لے آیا۔ چنانچہ نجاشی کا شمار اہلِ ایمان میں ہوتا ہے اور حضور ﷺ نے ان کی وفات پر ان کی غائبانہ نماز جنازہ بھی ادا کی۔ لیکن ان کا شمار صحابہ میں نہیں ہوتا' اس لیے کہ وہ حضور ﷺ کی زیارت نہیں کر سکے' البتہ ان کا شمار تابعین میں ہوتا ہے' کیونکہ وہ حضور ﷺ کے صحابہ کی صحبت میں رہے ہیں۔

لَا یُؤْمِنُ سے شروع ہونے والی تین مشہور احادیث

آج کی زیر مطالعہ حدیث حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما ہی سے مروی ہے' وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ))

''تم میں سے کوئی شخص اُس وقت تک حقیقی مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کی خواہش نفس اس کے تابع نہ ہو جائے جو میں لے کر آیا ہوں۔''

اس ضمن میں ایک دلچسپی کی بات یہ ہے کہ ''لَا یُؤْمِنُ'' سے شروع ہونے والی تین احادیث بہت معروف اور مشہور ہیں۔ پہلی حدیث ہے:

((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ))[1]

''تم میں سے کوئی شخص اُس وقت تک حقیقی مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اسے محبوب تر نہ ہو جاؤں اپنے باپ سے بھی' اپنے بیٹے سے بھی' اور تمام انسانوں سے بھی۔''

دوسری حدیث یوں ہے:

(۱) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب حب الرسول ﷺ من الایمان۔

((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ))(۱)

''تم میں سے کوئی شخص اُس وقت تک حقیقی مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اپنے (مؤمن) بھائی کے لیے وہی پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔''

اسی کے تحت درحقیقت دعوت وتبلیغ کا جذبہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر حق روشن کر دیا ہے تو میرا بھائی بھی اس سے محروم نہ رہے۔

لَا یُؤْمِنُ سے شروع ہونے والی تیسری حدیث آج ہمارے زیر مطالعہ ہے:

((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ ھَوَاہُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِہٖ))

''تم میں سے کوئی شخص حقیقی مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کی خواہشِ نفس تابع نہ ہو جائے اس کے جو میں لے کر آیا ہوں۔''

لَا یُؤْمِنُ کا مفہوم

یہ تین احادیث ہیں جو لَا یُؤْمِنُ سے شروع ہو رہی ہیں۔ اس ضمن میں ایک بات نوٹ کر لیجیے کہ لَا یُؤْمِنُ کا لفظی ترجمہ ''مؤمن نہیں ہوسکتا'' اس کو قانونی معنی میں نہیں لیا جاسکتا کہ ایسا کرنے والے سے ایمان ہی کی نفی کر کے اس پر کافر کا لیبل لگا دیا جائے۔ اربعین نووی کی حدیث ۳ ''حدیثِ جبریل'' کا مطالعہ ہم نے پانچ خطاباتِ جمعہ میں کیا تھا۔ وہاں ہم نے سمجھا تھا کہ قانونی ایمان اور ہے' حقیقی ایمان اور' اسی طرح قانونی اسلام اور ہے' حقیقی اسلام اور۔ ان کو دو علیحدہ علیحدہ categories میں سمجھنا ضروری ہے۔ لَا یُؤْمِنُ کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ کافر ہو گیا' بلکہ ایسی حدیثوں میں ایمان کے نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ایمانِ حقیقی نہیں ہے۔ عام طور پر علماء لَا یُؤْمِنُ کا ترجمہ ''اس کا ایمان کامل نہیں ہے'' کر دیتے ہیں' اس سے مجھے اختلاف ہے' اس لیے کہ اس سے انسان کی سوچ یہ بن جاتی ہے کہ کامل ایمان ہونا تو بہت اونچے درجے کی بات ہے' میرے لیے نیچے درجے کا ایمان ہی کافی ہے' چنانچہ اس لفظ سے انسان کے اندر جو تشویش پیدا ہونی چاہیے وہ پیدا نہیں ہوتی۔ جیسے ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(۱) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب من الایمان ان یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ۔

((وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ، وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ، وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ)) ''خدا کی قسم وہ شخص مؤمن نہیں ہے' خدا کی قسم وہ شخص مؤمن نہیں ہے' خدا کی قسم وہ شخص مؤمن نہیں ہے''۔ قِیْلَ مَنْ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ؟ پوچھا گیا کہ حضورؐ کون؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ((اَلَّذِیْ لَا یَاْمَنُ جَارُہٗ بَوَائِقَہٗ))(۱) ''وہ شخص کہ جس کا پڑوسی اس کی ایذا رسانی سے امن میں نہیں ہے''۔ اب یہ گناہ کبیرہ بھی نہیں ہے بلکہ اسے کج خلقی اور بداخلاقی سمجھ لیجیے۔ اس کے باوجود یہاں تین دفعہ قسم کھا کر لَا یُؤْمِنُ کہا گیا تو اس انداز اور اسلوب کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ کافر ہو گیا۔ اور اس کا یہ مفہوم بیان کرنا کہ اس کا ایمان کامل نہیں ہے' پھر کامل نہیں ہے' پھر کامل نہیں ہے تو اس سے حدیث کے اندر تشویق وترغیب کا جو پہلو ہے اور جو زور ہے وہی ختم ہو جائے گا۔ لہٰذا اس کا مناسب ترجمہ یہ ہوگا کہ وہ شخص حقیقتاً مؤمن نہیں ہے جس کا پڑوسی اس کی ایذا رسانیوں سے محفوظ نہ ہو۔

حقیقتاً مؤمن اور مسلمان ہونا اور بات ہے' جبکہ قانوناً مؤمن اور مسلمان ہونا اور ہے' اور اس کا دارومدار اقرار باللسان پر ہے کہ آپ نے زبان سے کہہ دیا: اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ اور آپ دین کی کسی بنیادی بات کا انکار نہیں کرتے تو آپ قانوناً مسلمان شمار ہوں گے۔ خواہ آپ فاسق ہیں' فاجر ہیں' گناہ گار ہیں' جو بھی ہیں مگر آپ کا شمار مسلمانوں میں ہوگا۔ آپ چوری کریں گے تو ہاتھ کٹ جائے گا مگر مسلمان رہیں گے۔ زنا کریں گے تو شادی شدہ ہونے کی حالت میں رجم کر دیے جائیں گے' لیکن اس صورت میں بھی آپ مسلمان رہیں گے اور آپ کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔ چنانچہ ایک ہے قانونی ایمان اور ایک ہے حقیقی ایمان اور ان دونوں میں فرق وتفاوت نہ کرنے سے بڑے بڑے مغالطے پیدا ہوتے ہیں۔ لہٰذا لَا یُؤْمِنُ کا ترجمہ یہ ہوگا کہ وہ شخص حقیقی مؤمن نہیں ہے۔

ہوائے نفس کے درجات

زیر مطالعہ حدیث میں لفظ ھَوٰی آیا ہے' اردو میں ہم اس کے لیے ہوائے نفس

(۱) صحیح البخاری' کتاب الادب' باب اثم من لا یامن جارہ بوائقہ۔

(خواہش نفس) بولتے ہیں۔ ہوائے نفس کے دو درجے ہیں۔ ایک تو وہ ہے کہ جو جبلی طور پر انسان کے تقاضے ہیں جسے جدید سائیکالوجی میں فرائڈ کی اصطلاحات میں iidd یا libido کہتے ہیں۔ جبلی طور پر انسان کو بھوک لگتی ہے تو وہ کھانا کھاتا ہے‘ اگر اس کو جنسی خواہش (sexual urge) ہے تو وہ شادی کرتا ہے یا پھر گناہ میں مبتلا ہوتا ہے۔ آرام بھی انسانی جسم کا تقاضا ہے تو اسے کچھ نہ کچھ آرام چاہیے۔ اسی طرح اور بھی انسان کے جبلی تقاضے ہیں۔ یہ جبلی تقاضے بھی خواہش نفس میں آتے ہیں لیکن ان کو کنٹرول کرنا ہے۔ رمضان کے مہینے کا مقصد ہی نفس کی تربیت کرنا اور نفس کو کنٹرول کرنا ہے۔ اسلام میں نفس کو کچلنے کا تصور نہیں ہے‘ اس لیے کہ نفس کو کچلنا رہبانیت ہے اور ((لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْاِسْلَامِ)) ’’اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔‘‘

خواہشِ نفس کا ایک دوسرا مرحلہ بھی ہے۔ دیکھئے ایک ہے زندہ رہنے کے لیے کھانا اور ایک ہے لذت کے لیے انواع و اقسام کے کھانوں کا لطف اٹھانا‘ تو یہ اسراف ہے۔ اسی طرح کپڑے آپ کی ضرورت ہیں‘ لیکن یہ کہ الماریاں کپڑوں سے بھری ہوئی ہوں‘ یہ غلط ہے‘ تعیش اور عیش پسندی ہے۔ اس دوسرے والے مرحلے پر آ کر نفس گویا باغی ہو جاتا ہے اور وہ پھر انسان کا مخالف اور دشمن بن جاتا ہے۔

ہوائے نفس کو معبود بنا لینا

نفس یا ہوائے نفس کی خرابی کے معاملے کو قرآن مجید نے مختلف انداز میں بیان کیا ہے اور اس ضمن میں سخت ترین انداز سورۃ الفرقان میں آیا ہے: ﴿اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ؕ﴾ (آیت ۴۳) ’’(اے نبی ﷺ!) کیا آپ نے دیکھا اُس شخص کو جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا معبود بنا لیا ہے‘‘۔ وارننگ اور خبردار کرنے کے لیے یہ سخت ترین الفاظ ہیں۔ یعنی کوئی زبان سے تو کہہ رہا ہے: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہ اللہ کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں‘ جبکہ حقیقت میں اس نے اپنے نفس کو معبود بنا رکھا ہے۔ اگر تو آپ خواہشِ نفس کے مکمل غلام ہو گئے بایں طور کہ خواہش نفس کو پورا کرنے میں لگے ہوئے ہیں‘ یہ دیکھے بغیر کہ کیا حلال ہے کیا حرام‘ تو اس اعتبار سے گویا نفس ہی آپ کا معبود ہے۔ کہنے کو تو کہہ

رہے ہو کہ میں اللہ کو معبود مانتا ہوں‘ لیکن درحقیقت آپ اپنے نفس کے بندے ہیں۔ آپ خواہشِ نفس کی پوجا کرنے والے ہیں اور نفس و خواہشات کے پرستار اور پجاری بن چکے ہیں۔

اس موضوع پر میری تفصیلی گفتگو ’’حقیقت و اقسامِ شرک‘‘ کے عنوان سے چھ گھنٹوں پر مشتمل خطابات کی صورت میں موجود ہے (جو کتابی شکل میں بھی شائع ہو چکی ہے)۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس ضمن میں وہ بہت سے لوگوں کے لیے بہت مفید ہو گی۔ ہم نے تو شرک صرف بت پرستی کو سمجھا ہوا ہے یا بہت موحد ہو جائیں تو قبر پرستی کو شرک مانتے ہیں‘ حالانکہ اس کے علاوہ بھی بہت سے شرک ہیں۔ نفس پرستی بھی شرک ہے‘ دولت پرستی بھی شرک ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ((تَعِسَ عَبْدُ الدِّيْنَارِ وَعَبْدُ الدِّرْهَمِ))(۱) ’’ہلاک ہو جائے درہم و دینار کا بندہ‘‘۔ نام تو عبدالرحمٰن ہے لیکن حقیقت میں عبدالدینار ہے اور خواہش یہ ہے کہ دینار آنے چاہئیں‘ چاہے حلال سے ہو یا حرام سے‘ لہٰذا اس کا معبود تو رحمٰن نہیں‘ دینار ہوا۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ اگر لکشمی دیوی کسی پر مہربان ہو جائے تو بہت دولت ملتی ہے‘ لہٰذا وہ اسے پوجتے ہیں۔ ہم نے اُن سے بھی دو قدم آگے بڑھ کر کہا کہ اس دیوی کو درمیان سے ہٹاؤ‘ ہم براہِ راست دولت کو پوجیں گے۔ اللہ اللہ خیر صلا!

اب جو شخص اس حد تک خواہش نفس کے پیچھے چلنے والا بن جائے تو اس کے بارے میں فرمایا: ﴿اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ؕ﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) کیا آپ نے دیکھا اس شخص کو جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا معبود بنا لیا ہے‘‘۔ ﴿اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ۝۴۳﴾ ’’تو کیا آپؐ ایسے شخص کی ذمہ داری لے سکیں گے‘‘۔ فرض کیجیے کہ ایسا شخص قیامت کے دن آپ ﷺ کے پاس شفاعت کی درخواست لے کر آئے تو کیا آپ ایسے شخص کی شفاعت کریں گے‘ کیا آپ ایسے شخص کی ذمہ داری قبول کریں گے؟

میں نے بارہا کہا ہے کہ اہم مضامین قرآن حکیم میں دو جگہ ضرور آتے ہیں۔ یہ جو نفس اور خواہش نفس کو معبود بنا لینے کا مضمون ہے‘ یہ پھر سورۃ الجاثیہ میں بھی آیا ہے اور

(۱) صحيح البخاری‘ كتاب الرقاق‘ باب ما يتقى من فتنة المال۔

یہاں بات بہت سخت ہوگئی۔ فرمایا: ﴿اَفَرَءَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰی عِلۡمٍ﴾ (آیت ۲۳) ''(اے نبی ﷺ!) کیا دیکھا آپ نے اس شخص کو جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا معبود بنالیا اور اللہ نے اسے گمراہ کر دیا اس کے علم کے باوجود''۔ یعنی عالم تو بہت بڑا ہے لیکن نفس کا پجاری ہے' یا علم سے مقصود مال و دولت کا حصول ہے یا علم کے ذریعے سے اُمراء کی ہم نشینی اور قرب اختیار کرنا اور ان سے فائدے اٹھانا اس کا مقصد ہے۔ اگر علم کا یہ مقصد ہے تو ایسا شخص علم کے باوجود گمراہ ہو جائے گا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے نبوت کا اعلان کیا تو اہل کتاب کے بڑے بڑے احبار و رہبان اس وقت موجود تھے اور وہ اپنے علم کے باوجود حضور ﷺ پر ایمان نہیں لائے۔ حالانکہ قرآن گواہی دیتا ہے: ﴿یَعۡرِفُوۡنَهٗ كَمَا یَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآءَهُمۡ ؕ﴾ (البقرۃ:۱۴۶) ''وہ آپ ﷺ کو ایسے پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں''۔ لیکن ایمان نہ لانے کی وجہ یہ تھی کہ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ حضور ﷺ پر ایمان لانے سے ہماری سیادت' ہماری چودھراہٹ' ہماری مسندیں ساری داؤ پر لگ جائیں گی۔ اب تو ہمارے فتوے پر لوگ عمل کرتے ہیں' ہمارے ہاتھ چومتے ہیں' ہمیں نذرانے دیتے ہیں' تو یہ سارا کچھ ختم ہو جائے گا' چنانچہ وہ اپنے علم کے باوجود ایمان نہیں لائے۔

اس حوالے سے میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں کہ نجران سے عیسائیوں کا ایک بڑا وفد آیا تھا اور اس نے کئی دن مدینہ منورہ میں مقیم رہ کر حضور ﷺ سے مباحثہ کیا۔ جب کسی نتیجہ پر نہیں پہنچے تو مباہلے کی آیت نازل ہوگئی کہ اب دلیل ختم ہوئی' آؤ اب مباہلہ کر لیں۔ مباہلے میں کہتے ہیں کہ اے اللہ! اگر یہ چیز حق ہے تو ہمیں تباہ کر دے۔ چونکہ ان پر حق واضح ہو چکا تھا تو اس کے لیے وہ تیار نہیں ہوئے' بلکہ راتوں رات چلے گئے۔ واپسی پر ایک واقعہ پیش آیا۔ اس وفد میں دو بھائی تھے۔ چلتے چلتے ایک بھائی کی سواری نے ٹھوکر کھائی تو اُس نے کہا: تَعِسَ الۡاَبۡعَدُ ''ہلاک ہو جائے وہ دور والا''۔ دوسرے بھائی نے پوچھا کہ اَلۡاَبۡعَد سے تمہاری مراد محمد (ﷺ) ہے؟ اس نے کہا: نہیں' وہ تو اللہ کے نبی ہیں۔ اُس نے پوچھا کہ پھر ان پر ایمان کیوں نہیں لاتے؟ اس نے کہا کہ شہنشاہِ

روم ہرقل نے ہمیں بہت سی مراعات دے رکھی ہیں اور اُن کی وجہ سے ہمیں بہت سے فائدے حاصل ہیں' اگر ہم محمد (ﷺ) پر ایمان لے آئیں تو وہ سب فائدے ہمارے ہاتھ سے چلے جائیں گے۔ چنانچہ یہ علم کے باوجود گمراہی ہے' اس لیے کہ یہاں خواہش نفس اور اپنے دنیوی مفادات معبود ہیں۔ اپنی حیثیت' اپنا مقام' اپنا مرتبہ' اپنی وجاہت' اپنا اقتدار حق کے قبول کرنے میں آڑے آ رہا ہے۔ یہی درحقیقت اپنے نفس کو معبود بنانا ہے۔

سرکشی کرنے اور نفس کی پیروی سے بچنے والوں کا انجام

خطاب کے آغاز میں' میں نے سورۃ النازعات کی آیات آپ کو سنائیں جن میں تقابلی انداز میں اس موضوع کو بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا: ﴿فَاَمَّا مَنۡ طَغٰی ﴿۳۷﴾.....﴾ ''پس جس نے سرکشی کی.....'' یہاں دو قسم کے لوگوں کا تذکرہ ہے' ان میں سے ایک وہ ہیں جو طغیانی و سرکشی پر اُتر آئے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی بات نہیں مانیں گے ــــ طَغٰی کا معنی ہے بڑھ جانا۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ دریا میں طغیانی آ گئی تو اس کا معنی یہ ہے کہ دریا اپنی حدود سے نکل کر اِدھر اُدھر تباہی پھیلا رہا ہے' کھڑی فصلیں تباہ ہو رہی ہیں' گاؤں بہہ رہے ہیں' یہ طغیانی ہے۔ اسی طرح نفس کی سرکشی اور نفس کا اکڑنا یہ ہے کہ وہ شریعت کا اتباع کرنے سے انکار کر دے اور حد سے باہر نکل جائے۔ ﴿وَاٰثَرَ الۡحَیٰوةَ الدُّنۡیَا ﴿۳۸﴾﴾ ''اور اس نے ترجیح دی دنیا کی زندگی کو''۔ سورۃ الاعلیٰ میں فرمایا: ﴿بَلۡ تُؤۡثِرُوۡنَ الۡحَیٰوةَ الدُّنۡیَا ﴿۱۶﴾ وَالۡاٰخِرَةُ خَیۡرٌ وَّاَبۡقٰی ﴿۱۷﴾﴾ ''بلکہ تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو۔ جبکہ آخرت بہتر بھی ہے اور باقی رہنے والی بھی''۔ چنانچہ جس شخص کے اندر اللہ' اللہ کے رسول (ﷺ) اور اللہ کے احکام و قوانین کے خلاف طغیانی و سرکشی ہے اور پھر وہ شخص دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دے رہا ہے تو اس کا انجام یہ ہے: ﴿فَاِنَّ الۡجَحِیۡمَ هِیَ الۡمَاۡوٰی ﴿۳۹﴾﴾ ''تو یقیناً اس کا ٹھکانہ جہنم ہے''۔

دوسری قسم کے لوگوں کا تذکرہ بایں الفاظ فرمایا: ﴿وَاَمَّا مَنۡ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ﴾ ''اور (اس کے برعکس) جو ڈرتا رہا اپنے رب کے حضور میں کھڑے ہونے سے'' یعنی

اسے یقین ہے کہ ایک وقت آئے گا جب اللہ کے حضور حاضر ہونا ہے اور اپنے اعمال و افعال کی جواب دہی ہونی ہے‘ تو یہ سوچ کر وہ کانپتا رہا‘ لرزتا رہا۔ ﴿وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ﴿۴۰﴾﴾ ’’اور اُس نے روکے رکھا اپنے نفس کو خواہشات سے‘‘۔ یعنی نفس کی لگام کھینچ کر رکھی اور اسے قابو میں رکھا۔ ایسے شخص کا انجام یہ ہوگا کہ: ﴿فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿۴۱﴾﴾ ’’تو یقیناً اُس کا ٹھکانہ جنت ہی ہے‘‘۔ اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ ‘ اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ !

جائز خواہشات کو جائز طریقے سے پورا کرنا

انہی آیات کی بہترین ترجمانی حضور ﷺ کی ایک اور حدیث میں ہے اور وہ حدیث بھی زیر مطالعہ حدیث کی طرح جوامع الکلم میں سے ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اَلْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهٗ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ))(۱) ’’(صحیح معنوں میں) سمجھ دار اور عاقل آدمی وہ ہے جو اپنے نفس کو اپنے تابع اور مطیع رکھے اور عمل کرے موت کے بعد کے لیے‘‘۔ یعنی وہ خود نفس کے تابع اور مطیع نہ ہو جائے‘ اور عمل کرے موت کے بعد کی ہمیشہ کی زندگی کے لیے۔

دنیا میں اپنی جائز ضروریات کو پورا کرنے اور بال بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے عمل کرنے کی نفی نہیں ہے‘ یہ تو کرنا ہی ہے‘ لیکن یہ سب حلال کے دائرے میں رہتے ہوئے ہونا چاہیے — یاد رکھیے کہ جائز ضروریات کو حلال و جائز طریقے سے پورا کرنا بہت اجر و ثواب کا باعث ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ((اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْاَمِيْنُ مَعَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ))(۲) ’’ایسا تاجر جو سچا ہے‘ امانت دار ہے‘ اس کو تو قیامت کے دن انبیاء‘ صدیقین اور شہداء کی معیت حاصل ہوگی۔‘‘

یہ صحیح ہے کہ اس دنیا کے لیے بھی کام کرو‘ لیکن اصل کام موت کے بعد کے لیے ہونا چاہیے۔ آپ کی بہتر صلاحیتیں آخرت کے لیے لگنی چاہئیں‘ اس لیے کہ آخرت کی زندگی تو

(۱) سنن الترمذی‘ ابواب صفة القيامة والورع والرقائق‘ باب منه۔

(۲) سنن الترمذی‘ ابواب البيوع‘ باب ماجاء فی التجار وتسمية النبی اياهم۔

ابدی و دائمی ہے۔ چنانچہ اگر آپ دنیا اور آخرت کی حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے باہمی نسبت و تناسب سے کام کر رہے ہیں تو پھر تو ٹھیک ہے اور اگر صرف انگلی کٹوا کر شہیدوں میں نام لکھوانے کے مصداق آخرت کے لیے بس برائے نام سعی و جُہد ہے‘ جبکہ باقی ساری جِدّوجُہد‘ ساری محنت‘ بھاگ دوڑ‘ سوچ بچار دنیا کے لیے ہے تو ایسی صورتِ حال میں دنیا آپ کی معبود بن گئی ہے۔ حالانکہ دنیا کے لیے صرف ضروریات کی حد تک معاملہ کرنے کی اجازت ہے اور اسی کی طرف رسول اللہ ﷺ نے بایں انداز اشارہ فرمایا: ((مَا قَلَّ وَكَفٰى خَيْرٌ مِّمَّا كَثُرَ وَاَلْهٰى))(۱) کہ اگر دنیوی ضروریات کے لیے بہت تھوڑا بھی انسان کو مل جائے جس سے اس کی ضروریات پوری ہو جائیں تو یہ اس سے بہتر ہے جو زیادہ ہو اور انسان کو آخرت سے غافل کر دے۔ ظاہر بات ہے کہ جب مال و دولت کی زیادتی ہوگی تو آپ اللہ سے غافل ہو جائیں گے‘ لیکن اگر مال اور آسائشیں کم ہوں گی تو آپ اللہ کی طرف رجوع کرتے رہیں گے۔ جیسے انجیل کی افتتاحی دعا میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ ’’ہماری آج کی روزی ہمیں آج عطا فرما‘ کل کی روزی ہمیں کل دیجیو!‘‘ چنانچہ جس مقدار سے انسان کی ضرورت پوری ہو جائے اور کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے تو وہ اس سے بہتر ہے جو زیادہ ہو اور اللہ سے غافل کر دے۔

اتباعِ ہوائے نفس سے بچنا لازم ہے!

قرآنِ مجید میں ’’اتباعِ ہوا‘‘ یعنی خواہشاتِ نفس سے بچنے کا حکم کئی مرتبہ آیا ہے۔ میں ان میں سے چھ آیات کا حوالہ دینا چاہتا ہوں:

(۱) الاعراف: ۱۷۶: پہلی آیت سورۃ الاعراف کی ہے اور یہ بَلعَم بن باعوراء کے تذکرے میں آئی ہے۔ بَلعَم بن باعوراء حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ایک عالم‘ زاہد اور صاحبِ کرامت بزرگ تھا‘ لیکن اپنی خواہشاتِ نفس کے پیچھے چلا اور شیطان کا چیلہ بن گیا تو وہ بدترین انجام کا حق دار ٹھہرا۔ وہاں الفاظ آتے ہیں: ﴿وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا

(۱) مسند احمد‘ كتاب مسند الانصار‘ باب باقی حديث ابی الدرداء۔

وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ﴾ (آیت ۱۷۶) ''اور اگر ہم چاہتے تو ان (آیات) کے ذریعے سے اسے اور بلند کرتے مگر وہ تو زمین کی طرف ہی دھنستا چلا گیا اور اس نے پیروی کی اپنی خواہشات کی''۔ ہمارا حیوانی وجود زمین سے آیا ہے اور اس کے سارے تقاضے بھی زمین سے پورے ہوتے ہیں۔ کھانے کے لیے جو کچھ اُگ رہا ہے وہ زمین سے اُگ رہا ہے۔ آپ نے اگر بکری کا گوشت کھایا ہے تو بکری نے بھی گھاس' پتے ہی کھائے ہیں جو زمین میں اُگے ہیں اور پھر انہی سے گوشت بنا ہے۔ چنانچہ ہماری اصل (origin) زمین سے ہے اور اسی سے ہماری غذائی ضروریات پوری ہو رہی ہیں۔ پھر جب یہ نفس ہم پر حاوی ہو جائے تو ہم نیچے بیٹھتے چلے جاتے ہیں' زمین میں دھنستے چلے جاتے ہیں' یعنی ہم اپنی خواہش نفس کے مطیع بن جاتے ہیں۔

(۲) الکہف: ۲۸: اتباعِ ہوائے نفس کے حوالے سے دوسری آیت سورۃ الکہف کی ہے جس میں خاص طور پر حضور ﷺ سے خطاب ہے۔ فرمایا: ﴿وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ﴿۲۸﴾﴾ ''اور مت کہنا مانیے ایسے شخص کا جس کا دل ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جو اپنی خواہشات کے پیچھے پڑا ہے اور اس کا معاملہ حد سے متجاوز ہو چکا ہے''۔ ویسے تو جو بھی ایمان لا رہا ہے' چاہے وہ غریب ہو' مسکین ہو' غلام ہو' سر آنکھوں پر اور اس کے بارے میں حضور اکرم ﷺ کو یہ تعلیم دی گئی: ﴿وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۸﴾﴾ (الحجر) ''اور اہلِ ایمان کے لیے اپنے کندھوں کو جھکا کر رکھیے''۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے ذہن میں یہ بھی تھا کہ اُمراء میں سے کوئی ایمان لے آئے تو ان فقراء اور غلاموں کی مشکلیں بھی آسان ہو جائیں گی' لہٰذا امراء کی طرف حضور ﷺ خصوصی توجہ فرماتے تھے۔ اسی ضمن میں وہ واقعہ پیش آیا عبداللہ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کا' جس پر گرفت ہو گئی:

﴿عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى ۝۱ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ۝۲ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى ۝۳ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ۝۴ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۝۵ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ۝۶ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ۝۷ وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ۝۸ وَهُوَ يَخْشٰى ۝۹ فَاَنْتَ عَنْهُ

تَلَهّٰى ۝۱۰﴾ (عبس)

''تیوری چڑھائی اور منہ پھیر لیا' اس بات پر کہ آیا اُس کے پاس نابینا۔ اور (اے نبی ﷺ) آپ کو کیا معلوم شاید کہ وہ تزکیہ حاصل کرتا' یا وہ نصیحت حاصل کرتا اور وہ نصیحت اس کے لیے مفید ہوتی۔ لیکن وہ جو بے نیازی دکھاتا ہے' آپ اُس کی تو فکر میں رہتے ہیں۔ اور اگر وہ پاکی اختیار نہیں کرتا تو آپ پر کوئی الزام نہیں۔ اور وہ جو آپؐ کے پاس دوڑتا ہوا آیا ہے' اور اس کے دل میں خشیت بھی ہے' تو اُس سے آپؐ استغناء برت رہے ہیں۔''

یہ کیا بات ہوئی کہ جو شخص چل کر آیا ہے' جس کے اندر تزکیہ حاصل کرنے کا جذبہ ہے اس سے آپ ذرا بے اعتنائی فرما رہے ہیں اور وہ لوگ جن کو کوئی پروا نہیں ہے اور وہ آپ کی باتوں پر توجہ ہی نہیں دیتے تو آپ ان کی طرف زیادہ توجہ کر رہے ہیں۔ یہاں بھی حضور اکرم ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ﴿۲۸﴾﴾ ''اور مت کہنا مانیے ایسے شخص کا جس کا دل ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جو اپنی خواہشات کے پیچھے پڑا ہے اور اس کا معاملہ حد سے متجاوز ہو چکا ہے''۔

(۳) طٰہٰ: ۱۶: اتباعِ ہوائے نفس کے حوالے سے تیسری آیت سورۂ طٰہٰ کی ہے جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے خطاب کے ضمن میں آیا ہے: ﴿فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى ﴿۱۶﴾﴾ ''تو (اے موسیٰ علیہ السلام! دیکھنا کہیں) تمہیں اس سے روگرداں نہ کر دے کوئی ایسا شخص جو اس پر ایمان نہیں رکھتا اور جو اپنی خواہشات کی پیروی کرتا ہے' (اگر ایسا ہوا) تو تم ہلاک ہو جاؤ گے''۔ حضور ﷺ سے خطاب میں بھی یہی لفظ آ رہا ہے کہ ان کی بات مت مانیے اور یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھی کہا جا رہا ہے کہ کہیں یہ لوگ آپ کے پائے ثبات میں لغزش پیدا نہ کر دیں جو اپنی خواہشات کی پیروی کر رہے ہیں۔

(۴) القصص: ۵۰: سورۃ القصص میں بھی یہی بات فرمائی گئی ہے: ﴿وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ۭ﴾ (آیت ۵۰) ''اور اُس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ

ہوگا جو اپنی خواہشات کی پیروی کر رہا ہو‘ اللہ کی طرف سے کسی ہدایت کے بغیر!‘‘ اگر اللہ کی ہدایت کے تابع چلتے ہوئے نفس کے تقاضے پورے کر رہے ہو تو ٹھیک ہے‘ لیکن اس سے آگے بڑھ کر یہ دنیا ہی مطلوب و مقصود اور محبوب بن جائے‘ اور آپ کی ساری محنت‘ بھاگ دوڑ‘ ساری پلاننگ سب کچھ اسی کے لیے ہو رہی ہو تو یہ صورتِ حال سراسر گمراہی ہے۔

(۵) صٓ :۲۶: سورۂ صٓ میں حضرت داؤد علیہ السلام سے کہا گیا: ﴿یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰی فَیُضِلَّكَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ﴾ (آیت ۲۶) ’’(ہم نے کہا:) اے داؤدؑ! ہم نے تمہیں زمین میں خلیفہ بنایا ہے‘ لہٰذا تم لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلے کرو اور خواہش نفس کی پیروی نہ کرنا کہ وہ تمہیں اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی۔‘‘

(۶) المائدۃ:۴۹: سورۃ المائدۃ میں حضور اکرم ﷺ سے فرمایا گیا: ﴿وَاَنِ احْكُمْ بَیْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ﴾ (آیت ۴۹) ’’اور (اے نبی ﷺ!) فیصلے کیجیے ان کے مابین اس (شریعت) کے مطابق جو کہ اللہ نے اُتاری ہے اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کیجیے‘‘۔ اس آیت کا پس منظر یہ ہے کہ مدینہ کے اندر منافقین بھی تھے اور کچھ بہت کمزور ایمان والے بھی موجود تھے۔ اب ان میں سے کسی سے کوئی قابلِ گرفت غلطی ہو گئی تو عبداللہ بن اُبی اُس کی سفارش کے لیے آ رہا ہے —— یہ خزرج کا سردار تھا اور اس کی حیثیت اور وجاہت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اسے مدینے کا بادشاہ بنانے کا فیصلہ ہو چکا تھا اور اس کے لیے سونے کا تاج بھی تیار ہو چکا تھا‘ لیکن نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ دو جہانوں کے بے تاج بادشاہ آ گئے تو اس کی شہنشاہیت اور تاج پوشی کا سارا معاملہ دھرا کا دھرا رہ گیا۔ چنانچہ اس کا دل حضور ﷺ کے خلاف حسد اور کدورت سے بھرا ہوا تھا — اب اس سے بڑا حضور ﷺ کا دشمن اور کون ہوگا — اب یہ کسی کمزور ایمان والے شخص کی سفارش لے کر آ رہا ہے تو اس بارے میں رسول اللہ ﷺ سے فرمایا گیا کہ ان کی خواہشات کی پیروی نہ کیجیے اور آپ کا فیصلہ بالکل اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قانون کے مطابق ہونا چاہیے۔

مَا جِئْتُ بِهٖ سے کیا مراد ہے؟

اب ایک اور علمی بات آ رہی ہے کہ زیر مطالعہ حدیث میں مَا جِئْتُ بِهٖ سے کیا مراد ہے اور اس کا مصداق کیا ہے —— ((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰی یَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ)) ’’تم میں سے کوئی بھی اس وقت تک کامل مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی دلی خواہشات میری لائی ہوئی شریعت اور دین کے تابع نہ ہوں‘‘ —— اب پہلی چیز جو آپ ﷺ لائے ہیں وہ قرآن حکیم ہے جو لفظ بلفظ محفوظ ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں قرآن مجید کو ایک جلد میں جمع کیا گیا تھا اور اب قرآن ’’مَابَیْنَ الدُّفَّتَیْن‘‘ ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ بِسم اللّٰہ کی با سے وَالنَّاس کی سین تک یہ سب اللہ کا کلام ہے اور قطعی اور حتمی طور پر ہر طرح سے محفوظ ہے۔ اس کی پیروی کرنا اور اس کے احکام کو ماننا لازم ہے۔ البتہ واضح رہے کہ قرآن کو سمجھنے اور اس سے احکام کو مستنبط کرنے کے لیے علم کا ہونا بہت ضروری ہے‘ اس لیے کہ اس قرآن کے اندر واضح احکام کے ساتھ ساتھ کبھی بات مجازاً ہوتی ہے‘ کبھی تمثیلاً ہوتی ہے اور کبھی اشارہ و کنایہ میں۔ نیز قرآن کا کوئی حکم خاص ہوتا ہے‘ کوئی عام ہوتا ہے۔

اس ضمن میں یہ بات بہت اہم ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کو قرآن کے خاص کو عام کرنے یا عام کو خاص کرنے کا حق حاصل تھا۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے‘ سورۃ النور میں زانی مرد و عورت کے لیے سو کوڑے کی جو سزا آئی ہے وہ عام ہے: ﴿اَلزَّانِیَةُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ﴾ ’’زانی مرد اور زانیہ عورت‘ دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو‘‘ —— حضور ﷺ نے اس سزا کو غیر شادی شدہ مرد و عورت کے لیے خاص فرمایا‘ جبکہ شادی شدہ زانی اور زانیہ کے لیے رجم کی سزا مقرر فرمائی‘ جو سنت سے ثابت ہے۔ گویا قرآن کے خاص کو عام کر دیا۔ اسی طرح قرآن میں حکم آیا کہ تم دو بہنوں کو بیک وقت نکاح میں جمع نہیں کر سکتے ﴿وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ﴾ (النساء:۲۳) حضور ﷺ نے اس حکم میں توسیع فرما دی کہ پھوپھی بھتیجی اور خالہ بھانجی کا بھی یہی حکم ہے کہ انہیں بھی بیک وقت نکاح میں نہیں رکھا جا سکتا۔

مزید برآں قرآنی احکام میں ناسخ و منسوخ کا معاملہ بھی ہے۔ ایک حکم پہلے نہیں آیا' بعد میں آ گیا۔ یا ایک حکم پہلے آیا' بعد میں تبدیل ہو گیا۔ شراب کی حرمت تدریجاً ہوئی ہے۔ جب تک آخری حکم نہیں آیا اس وقت تک لوگ پی رہے تھے' اس لیے کہ وہ حرام تو ہوئی ہی نہیں تھی۔ لہٰذا قرآنی احکام میں ناسخ و منسوخ کا معاملہ بھی دیکھنا پڑتا ہے۔ چنانچہ فہم قرآن کے لیے عربی زبان اور عربی گرامر کے فہم کے ساتھ ساتھ ذخیرۂ حدیث پر گہری نظر' اور ائمہ فقہاء اور سلف صالحین کی آراء کا بھی علم ہونا چاہیے کہ اسلاف نے یہاں کیا رائے قائم کی ہے اور ان کے کیا دلائل ہیں۔

اس کے علاوہ ایک دوسری چیز بھی حضور اکرم ﷺ لائے ہیں اور اس کے بارے میں خود رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اَلَا اِنِّیْ اُوْتِیْتُ الْکِتَابَ وَمِثْلَهٗ مَعَهٗ))(۱) ''آگاہ رہو کہ مجھے قرآن بھی دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ اس جیسی ایک اور شے بھی دی گئی ہے''۔ مِثْلَهٗ مَعَهٗ سے مراد سُنّتِ رسول ہے۔ سنت بھی گویا قرآن کے ہم پلّہ ہے۔ یہ سمجھنا کہ سنّت حجت نہیں ہے یا اس سے شرعی احکام ثابت نہیں ہوتے' یہ درحقیقت بہت بڑی گمراہیوں میں سے ہے جو سو' سوا سو سال سے بہت تیزی کے ساتھ ہمارے معاشرے کے اندر پھیلی ہے جب سے مغرب کے علوم' خاص طور پر سائنس اور فلسفہ وغیرہ ہمارے ہاں آئے ہیں اور غیروں کے تہذیب و تمدن نے ہمارے اندر رواج پایا ہے۔ چنانچہ حدیث کا استخفاف برعظیم پاک و ہند میں بہت عروج پر ہے' چاہے وہ علامہ مشرقی کی صورت میں ہو' یا غلام احمد پرویز' علامہ عبداللہ چکڑالوی یا اسلم جیراج پوری کی صورت میں۔ یہ لوگ جو ماڈرنسٹ کہلاتے ہیں' سنت کی حجیت کو ختم کرنے پر تلے ہوئے ہیں' حالانکہ رسول اللہ ﷺ کا واضح فرمان ہے کہ قرآن کے ساتھ اس جیسی ہی ایک اور شے اللہ نے مجھے دی ہے۔ اس پہلو سے قرآن مجید کے ساتھ سنت کا اتباع بھی لازم ہے۔

سُنّت کے مختلف درجات اور اقسام

سنت کا اتباع تو لازم ہے' البتہ آگے اس کے تین درجات ہیں: ایک تو سنت

(۱) سنن ابی داؤد' کتاب السُّنة' باب فی لزوم السُّنة۔

رسول (ﷺ) ہے' ایک خلفائے راشدینؓ کی سنت ہے اور ایک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سنت ہے۔ ایک بار آپ ﷺ نے اپنی امت کے گمراہ فرقوں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ سب دوزخ میں ہوں گے' سوائے ایک فرقہ کے۔ صحابہؓ نے پوچھا: اے اللہ کے رسول' وہ کون سا فرقہ ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ((مَا اَنَا عَلَیْهِ وَاَصْحَابِیْ))(۱) ''جس پر میرا اور میرے صحابہ کا عمل ہے''۔ یہاں آپؐ نے اپنے ساتھ صحابہ کو بھی جوڑ دیا۔ پھر صحابہ میں سے خاص طور پر خلفائے راشدین کے بارے میں علیحدہ سے فرمایا: ((عَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ الْمَهْدِیِّیْنَ))(۲) ''تم پر لازم ہے مضبوطی کے ساتھ پکڑنا میری سنت کو اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت کو''۔

اب میں سنت رسول کی قسموں میں سے چند ایک گنوا دیتا ہوں۔ ایک وہ سنت ہے جس کو ہم سنت تشریعی کہیں گے کہ جس سے شریعت کے احکام ثابت ہوتے ہیں۔ وہ فرض ہے' واجب ہے' سنت مؤکدہ ہے یا سنت غیر مؤکدہ' یہ سارے درجے علمائے کرام اور فقہائے عظام کے قائم کرنے کے ہیں' ایک عام آدمی خود فیصلہ نہیں کر سکتا کہ اس کے اندر درجہ بدرجہ کیا معاملہ ہے۔ بغرضِ تفہیم عرض کر رہا ہوں کہ آپ دائیں سے بائیں کی طرف جائیں تو ترتیب یوں ہوگی: فرض' واجب' سنت مؤکدہ' سنت غیر مؤکدہ' مستحب' مباح' مکروہ تنزیہی' مکروہ تحریمی اور حرام۔ فرض سے حرام تک نو درجے ہیں اور ظاہر بات ہے کہ ہر درجے کا اپنا ایک حق ہے۔

حضور ﷺ اپنے معمولات میں جبلی تقاضے بھی پورے کرتے تھے' مثلاً کھانا کھاتے تھے۔ تو اب کوئی یہ کہے کہ کھانا کھانا حضور ﷺ کی سنت ہے' تو یہ بات مناسب نہیں۔ یہ تو ایک جبلی تقاضا ہے جو آپ ﷺ نے پورا کیا۔ البتہ آپ ﷺ نے کچھ آداب سکھائے ہیں کہ ایسے کھاؤ تو اس پر عمل کرنا یقیناً سنت کے زمرے میں آتا ہے اور اس پر اجر بھی ملے گا۔ اسی طرح کھانے میں آپ ﷺ کو کدو پسند تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کدو کھانا

(۱) سنن الترمذی' ابواب الایمان' باب ما جاء فی افتراق هذه الامة۔

(۲) سنن الترمذی' ابواب العلم' باب ماجاء فی الاخذ بالسنة واجتناب البدع۔

لازم ہے‘ البتہ اگر کوئی حضور ﷺ سے محبت کی وجہ سے اُن کی پسندیدہ چیز کھائے تو اللہ کے ہاں اس کا ثواب ملے گا۔ اسی طرح ایک عادی تقاضے ہیں جنہیں ’’سنت العادت‘‘ کہا جاتا ہے۔ مثلاً عادت کے مطابق ہمیشہ آپ ﷺ نے تہبند باندھا۔ شلوار پیش کی گئی تو آپؐ نے اسے پسند فرمایا کہ یہ اچھی چیز ہے اور زیادہ ساتر ہے۔ رات کو آدمی سویا ہوا ہو تو تہبند کے اندر بے پردہ ہونے کا خطرہ رہتا ہے‘ جبکہ شلوار میں ایسا کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔

اس کے علاوہ بعض چیزیں یا بعض افعال حضور اکرم ﷺ کے ساتھ خاص ہیں جن کی پیروی لازم نہیں ہے‘ بلکہ حضور اکرم ﷺ نے حکماً ان کے کرنے سے روک دیا ہے۔ مثلاً صومِ وصال‘ یعنی دو دن یا تین دن کا مسلسل روزہ بغیر افطار اور سحری کے۔ آج صبح روزہ رکھا ہے‘ شام کو افطار نہیں کیا اور اس کے بعد بھی روزہ جاری ہے‘ اگلی شام کو جا کر افطار کیا۔ یا تیسرے دن کے غروبِ آفتاب پر افطار کیا۔ اس طرح یہ دو دن یا تین دن کا مسلسل روزہ ہو گیا۔ حضور اکرم ﷺ یہ روزہ رکھا کرتے تھے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں سے بعض نے یہ روزہ رکھنے کی اجازت چاہی تو آپ ﷺ نے روک دیا۔ انہوں نے کہا کہ حضور ﷺ آپ خود رکھتے ہیں اور ہمیں روکتے ہیں! تو آپ ﷺ نے فرمایا: ((اَیُّکُمْ مِثْلِیْ اِنِّیْ اَبِیْتُ یُطْعِمُنِیْ رَبِّیْ وَیَسْقِیْنِ))(۱) ’’تم میں سے کون میرے جیسا ہے؟ میں رات گزارتا ہوں اس حال میں کہ میرا رب مجھے کھلاتا اور مجھے پلاتا ہے‘‘۔ وہ کیا روحانی غذا ہے جو آپ ﷺ کو ملتی تھی‘ اس کا ہمیں اندازہ نہیں ہو سکتا‘ لیکن بہرحال رسول اللہ ﷺ نے سختی کے ساتھ صومِ وصال رکھنے سے منع فرما دیا۔

اسی طرح بعض چیزیں انسان کے علم اور تجربے سے متعلق ہیں۔ اہلِ مدینہ ’’تابیرِ نخل‘‘ کا معاملہ کرتے تھے۔ یعنی کھجور کے نر پھول اور مادہ پھولوں کو قریب قریب جوڑتے تھے تاکہ فرٹیلائزیشن ہو جائے۔ حضور ﷺ نے کہا کہ تم ایسا نہ کرو تو کیا ہے؟ اس لیے کہ فطرت اپنا انتظام خود کر لیتی ہے‘ تمہیں اس کے اندر دخل اندازی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ صحابہ کرامؓ نے جب تابیرِ نخل کا معاملہ نہیں کیا تو اس سے فصل کم ہو گئی۔ انہوں نے

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب الصوم‘ باب التنکیل لمن اکثر الوصال۔

حضور ﷺ کو بتایا کہ ہم نے تابیرِ نخل کا عمل نہیں کیا‘ لیکن اس سے فصل کم ہو گئی۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ((اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاَمْرِ دُنْیَاکُمْ))(۲) ’’تم اپنے دنیوی معاملات زیادہ جانتے ہو‘‘۔ یعنی میں نے کوئی شریعت کا حکم نہیں دیا تھا‘ بلکہ یہ دنیوی معاملات ہیں جو تجربے سے ثابت ہوتے ہوں اور وہ تم مجھ سے بہتر جانتے ہو۔

الغرض سنت سے استنباط کرنا‘ استدلال کرنا‘ نتیجہ نکالنا کہ کون سی سنت کس درجے کی ہے‘ اس کے لیے دین میں تفقہ کی ضرورت ہے اور حضور ﷺ نے بھی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے لیے خاص طور پر تفقہ فی الدین کی دعا کی تھی۔

اللہ تعالیٰ ہمیں دین کا فہم عطا فرمائے اور قرآن وسنت کے مطابق عمل کرنے اور اس کے مطابق اپنی زندگیاں گزارنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا ربّ العالمین!

اَقُوْلُ قَوْلِیْ هٰذَا وَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِیْ وَلَکُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتoo

(مرتب: حافظ محمد زاہد‘ ادارتی معاون‘ شعبہ مطبوعات)

(۱) صحیح مسلم‘ کتاب الفضائل‘ باب وجوب امتثال ما قاله شرعا .....

داعیٔ قرآن ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کی فکر انگیز تالیفات

سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں اسلامی انقلاب کے مراحل و مدارج اور لوازم

منہجِ انقلابِ نبوی ﷺ

مجلد 400 روپے، غیر مجلد 200 روپے

سیرت مطہرہ کے دل پذیر موضوع پر ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے آخری خطابات کا مجموعہ

سیرتِ خیرُ الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام

صفحات 240، قیمت 180 روپے

قرآنِ کریم کی اُصولی باتیں (۸)

پروفیسر ڈاکٹر عمر بن عبداللہ المقبل

ترجمہ: ابوعبدالرحمٰن شبیر بن نور

اکیسواں اصول:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ۝﴾

''اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو۔''

یہ اصول اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ کرنے اور اُس کی مخلوق کے ساتھ معاملہ کرنے میں بہت مضبوط اصول ہے' زندگی کی کامیابیوں کا راز ہے' اور معاشرتی زندگی کا ایک بڑا حصہ ہے۔ اور جو کوئی اس سچائی کے راستے پر چل نکلے' اس کے لیے خیر و برکت کی نشانی' بلند ہمتی کی دلیل اور کمالِ عقل کی پہچان ہے۔

جب نبی اکرم ﷺ اور آپؐ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم لمبے عرصے تک جہاد کر چکے اور دین کی خدمت اور اس کے تحفظ کی خاطر بڑی بڑی آزمائشوں سے گزر چکے' تو آخر میں یہ محکم اصول بیان ہوا۔ یہ اصول سورۃ التوبہ کے آخر میں نازل ہوا ہے جو کہ تقریباً آخری زمانے کی وحی ہے' اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِیِّ وَالْمُهٰجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ فِیْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ یَزِیْغُ قُلُوْبُ فَرِیْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَیْهِمْ ؕ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۱۷﴾ وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِیْنَ خُلِّفُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتْ عَلَیْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَیْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْۤا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَیْهِ ؕ ثُمَّ تَابَ عَلَیْهِمْ لِیَتُوْبُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۱۸﴾ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۱۱۹﴾﴾ (التوبۃ)

''اللہ تعالیٰ نے پیغمبر کے حال پر توجہ فرمائی اور مہاجرین و انصار کے حال پر بھی' جنہوں نے ایسی تنگی کے وقت پیغمبر کا ساتھ دیا اس کے بعد کہ ان میں سے ایک گروہ کے دلوں میں کچھ تزلزل ہو چلا تھا' پھر اللہ نے ان کے حال پر توجہ فرمائی۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان سب پر بہت ہی شفیق مہربان ہے۔ اور (اللہ نے توجہ فرمائی) تین شخصوں کے حال پر بھی جن کا معاملہ ملتوی چھوڑ دیا گیا تھا' یہاں تک کہ جب زمین باوجود اپنی فراخی کے ان پر تنگ ہونے لگی اور وہ خود اپنی جان سے تنگ آ گئے اور انہوں نے سمجھ لیا کہ اللہ سے کہیں پناہ نہیں مل سکتی بجز اس کے کہ اُسی سے رجوع کیا جائے۔ پھر ان کے حال پر توجہ فرمائی' تاکہ وہ آئندہ بھی توجہ کر سکیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ بہت توبہ قبول کرنے والا' بڑا رحم والا ہے۔ اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو۔''

جس پس منظر میں یہ اصول بیان ہوا ہے اور جو پیغام یہ لے کر آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ' آپ کے صحابہ کرامؓ اور بالخصوص ان تین حضرات (جن کے فیصلے کو مؤخر کر دیا گیا تھا) پر نظر رحمت فرمائی ہے' یہی حضرات سچے لوگوں کے امام ہیں' لہٰذا تم ان کی پیروی کرو۔ ان آیات کے بعد اس قرآنی اصول: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ۝﴾ ''اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو'' کے آنے کے معاملے پر جب تم غور کرو گے تو تمہیں معلوم ہوگا کہ ''سچائی'' کا معنیٰ و مفہوم صرف زبانی اقوال کی سچائی ہی نہیں ہوا کرتا' بلکہ اس کا معنیٰ زیادہ وسیع ہے' اور اقوال' افعال اور کردار کی سچائی کو شامل ہے' جس کو ہمارے نبی ﷺ نے اپنی ساری زندگی میں نبھا کر دکھایا ہے' نبی بننے سے پہلے بھی اور بعد میں بھی۔

نبی اکرم ﷺ کا کردار یہ تھا کہ آپ سچے' زبان کی حفاظت کرنے والے' معاملات میں امین' وعدہ وفا کرنے والے' اور معاہدے کی پاسداری کرنے والے تھے۔ اسی لیے نبوت ملنے سے پہلے بھی آپ کا لقب صادق و امین تھا اور آپ ﷺ کا یہی کردار بہت سارے عقلمند مشرکوں کے ایمان کا سبب بنا' گویا وہ زبانِ حال سے کہہ رہے تھے کہ: ''جو آدمی کسی انسان سے جھوٹ نہیں بولتا' کیسے ممکن ہے کہ وہ اللہ کے بارے میں جھوٹ بولے گا!''

بہت سارے لوگ جب اس قرآنی اصول کو سنتے ہیں: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ۝﴾ ''اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو'' تو ان کا ذہن گفتگو میں سچائی کی طرف جاتا ہے۔ درحقیقت یہ اس اصول کو سمجھنے میں کوتاہی ہے۔

اگر انسان اس اصول کا سیاق وسباق سمجھے تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ یہ قاعدہ زندگی کے ہر کردار کو شامل ہے' اس (صداقت) میں اقوال' افعال اور عام کردار سب شامل ہیں' جس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

سچ بولنے کے بہت سارے فائدے اور اچھے نتائج ہیں۔ یہ عقلمندی کی دلیل ہے' نیز حسنِ سیرت اور دل کی پاکیزگی کی علامت ہے۔ سچائی کے یہی فوائد بہت کافی ہیں کہ انسان جھوٹ کی ناپاکی' خودداری کی کمی اور منافقوں کی مشابہت سے بچا رہتا ہے۔ نیز سچائی کے ذریعے عزت' بہادری' معاشرے میں مقام' عزتِ نفس اور وقار کی زندگی گزارتا ہے۔

جن تین صحابہ کرام ﷺ کے فیصلے کو ایک وقت تک مؤخر کر دیا گیا تھا' جو آدمی ان کے انجام پر غور کرتا ہے اسے سچائی کی مٹھاس اور جھوٹ کی کڑواہٹ کا علم ہو جاتا ہے' خواہ یہ نتیجہ ایک وقت کے بعد ہی ظاہر ہو۔ اور جو آدمی ان آیات پر غور کرتا ہے جن میں سچائی کی تعریف کی گئی ہے اور سچوں کی مدح کی گئی ہے' اسے انتہائی دل پسند نتائج ملتے ہیں۔ چنانچہ سچا آدمی انبیاء ورسل علیہم الصلاۃ والسلام کے راستے پر چل رہا ہوتا ہے' جن کی اللہ تعالیٰ نے متعدد آیات میں تعریف فرمائی ہے' کہ وہ اپنے وعدے اور گفتگو میں سچے تھے۔

سچے آدمی کے ساتھ ہمیشہ تعاون ہوا ہے اور اُس کی مدد کی گئی ہے' اور اللہ تعالیٰ نے اس کی خاطر ایسی جگہ سے ایسے اسباب پیدا کر دیے ہیں جن کا اس کو سان گمان نہ تھا' بلکہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا مخالف ہی اس کی طرف سے دفاع کرنے والا بن جائے۔ جیسا کہ مصر کے بادشاہ کی بیوی نے حضرت یوسف علیہ السلام کا دفاع کرتے ہوئے کہا تھا: ﴿اَلْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ ۫ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۵۱﴾ (یوسف) ''اب تو سچی بات نتھر آئی ہے' میں نے ہی اسے ورغلایا تھا اس کے جی سے اور یقیناً وہ سچوں میں سے ہے۔''

اور سچا انسان اس راستے پر چل رہا ہوتا ہے جو اسے جنت تک پہنچا دیتا ہے۔ کیا یہ بات اللہ کے رسول ﷺ نے نہیں فرمائی:

((عَلَيْكُمْ بِالصِّدْقِ، فَإِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِي إِلَى الْبِرِّ، وَإِنَّ الْبِرَّ يَهْدِي إِلَى الْجَنَّةِ، وَمَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَصْدُقُ وَيَتَحَرَّى الصِّدْقَ حَتَّى يُكْتَبَ عِنْدَ اللّٰهِ صِدِّيقًا)) (صحيح البخاري /٥٧٤٣ وصحيح مسلم /٢٦٠٧ واللفظ له)

''سچائی کو اپنا شیوہ بنا لو' بلاشبہ سچائی انسان کو نیکی کی راہ دکھاتی ہے اور نیکی جنت تک پہنچا

دیتی ہے۔ انسان مستقل سچ بولتا رہتا ہے اور سچائی کی تلاش میں رہتا' بالآخر اللہ تعالیٰ کے ہاں ''صدیق'' (بہت زیادہ سچا) لکھ دیا جاتا ہے۔''

اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑی حاضری کے دن صرف سچے لوگ ہی نجات پا سکیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ۭ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝۱۱۹﴾ (المائدة)

''اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا کہ یہ وہ دن ہے کہ جو لوگ سچے تھے ان کا سچا ہونا ان کے کام آئے گا۔ اُن کو باغ ملیں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی' جن میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان سے راضی اور خوش اور یہ اللہ سے راضی اور خوش ہیں۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔''

اور سچے لوگ ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے معافی کے حقدار ہوں گے اور اُس اجر وثواب کے حقدار ہوں گے جو اللہ تعالیٰ نے اُن کے لیے تیار کیا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّاۗىِٕمِيْنَ وَالصّٰۗىِٕمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ۝۳۵﴾ (الاحزاب)

''بے شک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں' مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں' فرمانبرداری کرنے والے مرد اور فرمانبردار عورتیں' راست باز مرد اور راست باز عورتیں' صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں' عاجزی کرنے والے مرد اور عاجزی کرنے والی عورتیں' خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں' روزے رکھنے والے مرد اور روزے رکھنے والی عورتیں' اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں' بکثرت اللہ کا ذکر کرنے والے مرد اور ذکر کرنے والی عورتیں' ان سب کے لیے اللہ تعالیٰ نے وسیع مغفرت اور بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔''

مذکورہ بالا حقائق کے باوجود' انتہائی افسوسناک اور دردناک بات یہ ہے کہ مسلمان معاشروں

میں اس قرآنی اصول: ﴿یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ۝﴾ ''اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو'' کی دھجیاں اُڑائی جارہی ہیں۔ لوگ اپنی گفتگو میں کس قدر جھوٹ بولتے ہیں' کس قدر وعدے کی خلاف ورزی کرتے ہیں' اور کتنے ہی لوگ معاہدے کو توڑ دیتے ہیں۔ اور مسلمانوں میں ہی وہ لوگ ہیں جو رشوت کا لین دین کرتے ہیں' اور اس طرح جو منصب دے کر انہیں امین بنایا گیا تھا اس میں خیانت کرتے ہیں' اور وہ بھی مسلمان ہی ہیں جو معاہدوں اور سرکاری دستاویزات کے اندر ردّ وبدل کر دیتے ہیں۔ اور بھی ہیر پھیر کی بہت سی شکلیں موجود ہیں۔

افسوسناک بات یہ ہے کہ ان لوگوں کے کردار نے اسلام کے چمکدار چہرے کو دھندلا دیا ہے' جبکہ اسلام کا تو سارا نظام ہی سچائی کی بنیاد پر قائم ہے۔

اے کاش! یہ لوگ اس واقعے پر ہی غور کر لیتے جو اسلام قبول کرنے سے پہلے ابوسفیان کے ساتھ پیش آیا جبکہ وہ شام کی سرزمین میں تھے۔ ہوا یوں کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ہرقل کے نام خط آیا تو ہرقل نے پوچھا: ''کیا یہاں اُس شخص کی قوم کا کوئی آدمی موجود ہے جس کا دعویٰ ہے کہ وہ نبی ہے؟'' حاضرین نے کہا کہ ہاں موجود ہے۔ (ابوسفیان کہتے ہیں:) مجھے دوسرے قریشیوں کے ہمراہ دربار میں طلب کیا گیا' چنانچہ ہم ہرقل کے پاس آ گئے' اور ہمیں اس کے سامنے بٹھا دیا گیا۔ ہرقل نے پوچھا: ''تم میں سے کون آدمی نسب کے لحاظ سے اُس شخص کا قریبی رشتہ دار ہے جو نبوت کا دعویدار ہے؟'' ابوسفیان نے کہا: ''میں!'' تو انہوں نے مجھے ہرقل کے بالکل سامنے لا بٹھایا اور میرے ساتھیوں کو میرے پیچھے بٹھا دیا۔ پھر اُس نے مترجم کو بلا لیا۔ ہرقل نے مترجم سے کہا: ''ان لوگوں سے کہو کہ میں ابوسفیان سے اُس شخص کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں جو نبوت کا دعویدار ہے' اگر یہ (ابوسفیان) میرے سامنے جھوٹ بولے تو تم لوگ اس کی تردید کر دو۔ ابوسفیان نے کہا: ''قسم بخدا! اگر مجھے اس بات کا اندیشہ نہ ہوتا کہ جھوٹ بولنا میرے شخصی وقار کے خلاف ہے تو میں جھوٹ بول دیتا۔''

اے میرے مسلمان بھائی! ذرا غور تو کرو' وہ آدمی جو اُس وقت تک مشرک تھا' کس طرح جھوٹ سے دور بھاگ رہا ہے' اس لیے کہ وہ جھوٹ بولنے کو برائی اور گالی سمجھتا ہے' جو کسی ایسے شخص کے لیے مناسب نہیں جسے سچائی کی عظمت اور جھوٹ کی برائی کا علم ہو۔ یہ عربی جوان کی شرافت تھی جو جھوٹ کو انتہائی برے اخلاق میں شمار کر رہا تھا۔

کہاں یہ اخلاقی عظمت اور کہاں وہ لوگ جو مسلسل جھوٹ بولتے رہتے ہیں؟ بلکہ جھوٹ بولنے کو عام سی بات سمجھتے ہیں۔ پھر اسی پر بس نہیں' بلکہ جھوٹ بولنے میں کفار کی عادات کو رواج دیا ہے۔ جیسا کہ یکم اپریل کا جھوٹ ہے' اور اسے سفید جھوٹ کا نام دیا گیا ہے۔ انہیں خبر ہی نہیں کہ ہر قسم کا جھوٹ سیاہ ہی ہوتا ہے۔ ہاں جس جھوٹ کی شریعت نے اجازت دی ہے اس کا حکم دوسرا ہے۔

اے والدین اور مربّی حضرات! کیا ہی اچھی بات ہو کہ ہم آئندہ آنے والی نسلوں کی تربیت سچ جیسے عظیم اخلاق پر کریں اور جھوٹ سے انہیں نفرت ہو اور ہم خود بھی اس کی بہترین زندہ مثال بنیں جسے ہماری آنے والی نسلیں کھلی آنکھ سے دیکھیں۔

بائیسواں اصول:

﴿اِنَّهٗ مَنْ یَّتَّقِ وَیَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ۝﴾

''جو بھی پرہیزگاری اور صبر کرے تو اللہ تعالیٰ کسی نیکوکار کا اجر ضائع نہیں کرتا۔''

کسی انسان کا اپنے خالق کے ساتھ معاملہ کرنے اور مخلوقِ خدا کے ساتھ معاملہ کرنے کے حوالے سے یہ اصول بہت مفید ہے۔ جس شخص کی محنت کا دنیا میں اعتراف نہ ہوتا ہو اس کے لیے بھی یہ بہت بڑا سہارا ہے۔ حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام کے واقعے کے پس منظر میں یہ اصول بیان ہوا ہے' جب ان کے بھائی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے عرض کیا:

﴿یٰۤاَیُّهَا الْعَزِیْزُ مَسَّنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَیْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَیْنَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَجْزِی الْمُتَصَدِّقِیْنَ۝۸۸ قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِیُوْسُفَ وَاَخِیْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ۝۸۹ قَالُوْۤا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ یُوْسُفُ ؕ قَالَ اَنَا یُوْسُفُ وَهٰذَاۤ اَخِیْ ۫ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَیْنَا ؕ اِنَّهٗ مَنْ یَّتَّقِ وَیَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ۝۹۰﴾ (یوسف)

''اے عزیز! ہم کو اور ہمارے خاندان کو دکھ پہنچا ہے' ہم حقیر سی پونجی لائے ہیں' پس آپ ہم کو پورے غلے کا ناپ دیجئے اور ہم پر خیرات کیجئے' یقیناً اللہ تعالیٰ خیرات کرنے والوں کو بدلہ دیتا ہے۔ یوسف نے کہا: تم جانتے بھی ہو کہ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ اپنی نادانی کی حالت میں کیا کیا تھا؟ انہوں نے کہا: کیا واقعی تو ہی یوسف ہے؟ جواب دیا کہ ہاں میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے' اللہ نے ہم پر فضل

وکرم کیا۔ بات یہ ہے کہ جو بھی پرہیزگاری اور صبر سے کام لے تو اللہ تعالیٰ کسی نیکوکار کا اجر ضائع نہیں کرتا۔''

ہم میں سے بہت سارے لوگوں کو تقویٰ کی تعریف آتی ہے' بلکہ ہم میں سے کوئی ایسا بھی ہوگا جسے تقویٰ اور صبر کی بہت ساری تعریفیں آتی ہوں گی اور وہ صبر کی بہت ساری قسموں کو بھی جانتا ہوگا' پھر بھی وہ صبر کے پہلے ہی امتحان میں فیل ہو جاتا ہے' اور جہاں کہیں صبر کرنے کا موقع ہوتا ہے تو اس کا عملی مظاہرہ کرنے میں پیچھے رہ جاتا ہے۔ میرا کہنے کا مقصد یہ نہیں کہ وہ گناہ سے بالکل ہی محفوظ ہوگا۔ میرا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جب صبر کرنے اور تقویٰ کا موقع آتا ہے یا اس کی ضرورت ہوتی ہے تو اِلّا ماشاء اللہ ہم میں سے اکثر اس پر عمل کرنے میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ ہم سب کو یاد ہے کہ تقویٰ کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرنا اور ممنوعہ کاموں سے بچنا۔ اور ہم سب کو یہ بھی معلوم ہے کہ اس کام میں خود بھی صبر کرنا ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی صبر کی تلقین کرنی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے حکم کے مطابق اپنے نفس کو روک کر رکھنا ہوتا ہے۔ بے شک ان دونوں عظیم کاموں پر ضرورت کے موقع پر عمل کرنا ہی اونچے مقام کی بات ہے۔

تیئیسواں اصول:

﴿وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا﴾

''اور گھروں کو ان کے دروازوں سے آؤ۔''

یہ قرآنی اصول اہل جاہلیت کی ایک عادت کے حوالے سے بیان ہوا ہے۔ اُن کی عادت تھی کہ جب احرام باندھ لیتے (اور اس کے بعد کوئی ضرورت پیش آ جاتی) تو گھروں میں دروازوں کے ذریعے نہ آتے اور اس کو بھی عبادت کا حصہ سمجھتے' اور اُن کا گمان تھا کہ یہ بھی ایک نیکی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بتایا یہ نیکی نہیں ہے' اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اِسے مقرر نہیں کیا ہے' جیسا کہ آیت کے شانِ نزول میں بیان ہوا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ۭ قُلْ هِىَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ۭ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۱۸۹﴾ (البقرۃ)

''(اے نبی ﷺ!) لوگ آپ سے چاند کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ آپ کہہ

دیجیے کہ یہ لوگوں کی عبادت کے وقتوں اور حج کے موسم کے لیے ہے۔ اور (احرام کی حالت میں) گھروں کے پیچھے سے تمہارا آنا کچھ نیکی نہیں' بلکہ نیکی والا وہ ہے جو متقی ہو۔ اور گھروں میں تو دروازوں سے آیا کرو' اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔''

جس خطا کی اصلاح کی خاطر یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی اُس کی تو اس قرآنی اصول نے بہت شاندار طریقے سے اصلاح کر دی۔ اس کے علاوہ بھی بہت ساری صورتوں میں یہ عظیم قرآنی اصول لاگو ہوتا ہے' جس میں فرمایا گیا: ﴿وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا﴾ ''اور گھروں میں ان کے دروازوں سے آیا کرو''۔ جو شخص اس ضمن میں علماء کرام کے فرمودات کو تلاش کرے' یا اس اصول کو عملاً نافذ کرنے کی صورتوں پر غور کرے تو اُسے بہت ساری صورتیں نظر آئیں گی۔ مثلاً:

(۱) اللہ تعالیٰ کی عبادت ہی اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا صحیح راستہ ہے۔ جو اللہ تعالیٰ تک رسائی چاہتا ہو' اُسے وہی راستہ اپنانا چاہیے جو اُسے منزل تک پہنچا سکے' اور یہ کام اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اُس راستے کو نہ اختیار کرے جسے رسول اللہ ﷺ نے مقرر فرمایا ہے۔ چنانچہ جو کوئی اللہ کی کسی ایسی شکل میں عبادت کرے جسے اللہ تعالیٰ یا اللہ کے رسول ﷺ نے مقرر نہیں کیا تو وہ اپنی منزل پر دروازے کے ذریعے نہیں آیا' بلکہ اس نے دین میں بدعت کا راستہ اختیار کیا اور اس کی ساری محنت مردود قرار پائی۔

(۲) لفظ اور معنیٰ کے عموم سے یہ بات لی جا سکتی ہے کہ ہر اہم کام کے لیے ضروری ہے کہ اس کے صحیح دروازے سے آیا جائے' اور اس تک پہنچنے کا یہی سب سے قریبی راستہ اور طریقہ ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ اسباب و وسائل کے بارے میں اچھی طرح علم ہو' تاکہ طالبِ منزل اچھے' قریب ترین' آسان ترین اور جلد کامیابی تک پہنچانے والے راستے کا انتخاب کرے۔ اور اس بات میں کوئی فرق نہیں کہ معاملہ علمی ہے یا عملی' دینی ہے یا دنیاوی' اُس کا اپنا ذاتی معاملہ ہے یا دوسرے بھی اس میں شریک ہیں۔ اور یہی حکمت کا تقاضا ہے۔

(۳) علمِ شرعی حاصل کرنا مقصود ہو یا دنیوی علم حاصل کرنا ہو۔ اور یہی معاملہ رزق کمانے کا ہے۔ چنانچہ جو کوئی صحیح راہ پر چلا' محنت سے کام کیا' صحیح دروازے سے داخل ہوا اور منزل تک پہنچانے والے راستے کو اختیار کیا' یقیناً وہ کامیاب و کامران ہوگا اور اپنی منزل پالے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۠﴾ ''اور گھروں کو ان کے دروازوں سے

آؤ''۔ اور جس قدر مطلوبہ کام اہم ہوگا اسی قدر اس اصول کی ضرورت زیادہ ہوگی' اور ضروری ہوگا کہ منزلِ مقصود کو پانے کے لیے سب سے زیادہ صحیح اور سیدھے راستے کو اپنایا جائے۔

(۴) اس قرآنی اصول پر عمل کرنے کی ایک شکل لوگوں سے بات کرنے کی صورت میں ہوتی ہے۔ آیت کریمہ ہماری راہنمائی کر رہی ہے کہ مؤمن کی ذمہ داری ہے کہ وہ بات کرنے میں مناسب طریقہ اختیار کرے' مناسب موضوع کا انتخاب کرے جس کا بیان کرنا اچھا ہو' مناسب وقت کا انتخاب کرے' جس شخص یا جن لوگوں کے سامنے بات کرنی ہے ان کے مرتبے کا دھیان رہے۔ کیونکہ ہر جگہ کے لحاظ سے بات کا انداز اپنا ہوتا ہے' ہر موقع کے لحاظ سے گفتگو ہوتی ہے' اور ہر کام کا ایک مقام ہوتا ہے۔ لہٰذا جو شخص علم یا مقام کے اعتبار سے کسی بڑی شخصیت سے گفتگو کرے تو اُس سے اِس طرح بات نہ کرے جس طرح عام آدمیوں سے بات کرتا ہے۔ اس سلسلے میں فیصلہ کن چیز حکمت و دانائی ہے اور جس کو حکمت و دانائی عطا ہوگئی اُسے بہت بڑی خیر مل گئی۔

(۵) اس قرآنی قاعدے پر عمل کرنے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ معاشرتی اور خاندانی مشکلات و مسائل حل کرنے کے لیے مناسب طریقے اپنائے جائیں۔ جانچ پڑتال اور غور و فکر کے بعد مشکلات کا مناسب حل نکالا جائے' اس آیت کریمہ نے ان تمام باتوں کی طرف ہماری راہنمائی کی ہے۔ جس کسی نے ان اصولوں کی خلاف ورزی کی اس کی مشکلات بڑھ گئیں اور ان کا حل بھی مشکل ہوگیا۔

ہر حال میں ہماری ذمہ داری ہے کہ ہر قسم کی مشکلات اور پریشانیوں میں قرآنِ حکیم اور سنتِ رسول اللہ ﷺ سے راہنمائی حاصل کریں اور اس بات پر مکمل یقین رکھیں' اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ﴾ (الاسراء: ۹) ''بلاشبہ یہ قرآن سب سے زیادہ سیدھی راہ کی طرف راہنمائی کرتا ہے''۔ اور یہ راہنمائی ہر کام میں ملتی ہے۔ عقائد میں' حلال و حرام کے احکام میں' معاشرتی' اقتصادی اور سیاسی مسائل میں۔ لیکن اصل کوتاہی ہمارے اپنے اندر ہے کہ ہم مشکلات میں اپنے رب کی کتاب سے راہنمائی حاصل کرنے میں سستی و کوتاہی کا شکار ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ ہمیں اپنی کتاب کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے' اس کی راہنمائی پر عمل کرنے کی توفیق دے' اور اس کے نور سے روشنی حاصل کرنے کی توفیق بخشے — آمین!

چوبیسواں اصول:

﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾

''اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم انہیں اپنی راہ ضرور دکھا دیں گے۔''

یہ اصول سورۃ العنکبوت کے آخر میں بیان ہوا ہے' اور اس سورت کی ابتدائی آیات یہ ہیں:

﴿الٓمّٓ ① اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ② وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ③﴾ (العنکبوت)

''الٓم۔ کیا لوگوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ اُن کے صرف اِس دعوے پر کہ ہم ایمان لائے ہیں' ہم انہیں بغیر آزمائے ہوئے ہی چھوڑ دیں گے؟ ان سے اگلوں کو بھی ہم نے خوب جانچا' یقیناً اللہ تعالیٰ انہیں بھی جان لے گا جو سچ کہتے ہیں اور انہیں بھی معلوم کر لے گا جو جھوٹے ہیں۔''

سورۃ العنکبوت کا اختتام اس اصول پر ہو رہا ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ (العنکبوت: ۶۹) ''اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم انہیں اپنی راہ ضرور دکھا دیں گے''۔ یہ دراصل اس ممکنہ سوال کا جواب ہے جو اِس سورت کے ابتدائی حصہ کی تلاوت کرنے والا مؤمن کر سکتا ہے۔ جو شخص بھی اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت کا کام کرے اس کے بارے میں یہ ایک شرعی حقیقت اور خدائی سنت کا بیان ہے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سورت کے شروع میں جس آزمائش کا ذکر آیا ہے' اُس سے نکلنے کا راستہ کیا ہے؟ تو سورت کے آخر میں اس قرآنی اصول کے ذریعے اِس سوال کا جواب دیا گیا ہے۔ فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ ''اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم انہیں اپنی راہ ضرور دکھا دیں گے''۔ کہ مشقت تو لازماً اٹھانی ہی ہے اور اس میں مقصد کے ساتھ اخلاص اور خلوص بھی ضروری ہے' تب جا کر ہدایت نصیب ہوگی اور اللہ کے حکم سے توفیق مل جائے گی۔

جو بھی اس راستے پر چلنا چاہے اسے اس راہ کی مشکلات کا علم ہونا چاہیے تاکہ معاملہ اس کے سامنے بالکل واضح ہو کہ دعوت الی اللہ کا راستہ اِسی طرح کا ہی ہوتا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا

اور نہ کبھی ہوگا کہ یہ راہ پھولوں کی سیج ہو‘ بلکہ ہمیشہ سے یہ کانٹوں بھری راہ ہے۔ اس لیے کہ ایمان ایک کلمہ ہی نہیں ہے کہ بس (زبان سے) کہہ دیا‘ بلکہ یہ تو ایک حقیقت ہے جس کے ساتھ ذمہ داریاں لگی ہوئی ہیں‘ ایسی امانت ہے جس کو محنت سے ادا کرنا ہوتا ہے‘ ایک جہاد ہے جس کو صبر سے ادا کرنا ہوتا ہے‘ اور مسلسل محنت ہے جس کو برداشت کرنا ہوتا ہے۔ اتنا ہی کافی نہیں کہ لوگ کہہ دیں کہ ہم ایمان لائے اور انہیں اس دعوے کے بعد ایسے ہی چھوڑ دیا جائے‘ بلکہ انہیں آزمائش میں ڈالا جائے گا۔ پھر وہ اپنے ایمان پر ثابت قدمی دکھائیں اور اپنے امتحان سے صاف ستھرے نکل آئیں اور اُن کے دل بھی خالص ہو جائیں‘ جیسا کہ سونے کو بھٹی میں ڈال کر پگھلایا جاتا ہے تاکہ اس سے غیر متعلقہ نکمے مادّے علیحدہ ہو جائیں۔

سورۃ العنکبوت کے آخر میں بیان ہونے والے اس قرآنی اصول: ﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ ’’اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم انہیں اپنی راہ ضرور دکھا دیں گے‘‘ کا تعلق سورت کی ابتدائی آیات سے واضح ہو گیا تو جان لیں کہ دعوت کے میدان میں اس اصول کے معنی اور مفاہیم بہت زیادہ ہیں اور لمبے چوڑے ہیں۔ یہ اصول بڑی وضاحت کے ساتھ بتا رہا ہے کہ جو شخص دعوت کے راستے پر چل رہا ہو اور وہ ہدایت و توفیق کا طلب گار بھی ہو‘ اُسے اِن دو بنیادی کاموں پر عمل کرنا ہوگا‘ جن کو یہ اصول بیان کر رہا ہے:

پہلا کام: انسان اللہ تعالیٰ کے جس راستے کی طرف لوگوں کو دعوت دے رہا ہے‘ اُسے اپنی منزل تک پہنچنے کی خاطر مسلسل محنت اور جہاد کی ضرورت ہے۔

دوسرا کام: اللہ تعالیٰ کے لیے خالص ہونا ہے‘ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا﴾ ’’اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں‘‘ چنانچہ ان کا جہاد اپنی ذات کی خاطر نہیں ہے‘ اور نہ ہی دنیا کے سراب کی خاطر ہے‘ اور نہ ہی اقتدار اور کرسی کی خاطر ہے‘ بلکہ یہ جہاد تو خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر ہے۔

اس اصول میں بالخصوص اِخلاص کی طرف توجہ دلائی گئی ہے‘ حالانکہ اخلاص تو ہر کام میں قبولیت کی شرطِ اوّل ہے‘ اس لیے کہ کچھ دعوت دینے والے علماء دعوت کا کام کرتے ہیں یا کسی دوسرے نیک کام میں محنت کرتے ہیں اور ان کا مقصد اس طرح کی شہرت حاصل کرنا ہوتا ہے جیسے کہ فلاں عالم کو ملی ہے‘ یا پیسہ کمانا ہوتا ہے جیسے کہ فلاں خطیب نے دولت کمائی ہے۔ چنانچہ ہر نیک عمل میں اس اصول کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ یہاں پر اس اصول کی طرف توجہ دلانے

کی ایک اور وجہ بھی ہے‘ کہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان ابتدا میں پورے خلوص سے کام شروع کرتا ہے‘ پھر کچھ وقت گزر جانے کے بعد جب کبھی اُس کے سامنے اُن چیزوں کی چمک آئی جو انسانی دل کو لبھاتی ہیں یا دوسروں کو اُس پر ترجیح ملی‘ یا کسی مرتبے کی امید ہوئی یا اونچا ہونے‘ قابلِ فخر ہونے یا مدِمقابل پر فتح پانے کا موقع ملا‘ (لیکن اسے اپنی مراد نہ مل سکی) تو اس کا مخلصانہ جذبہ کم ہو جاتا ہے۔

لہٰذا اس عظیم مقام پر‘ یعنی جہاد و مجاہدے کے مقام پر‘ اس بنیادی اصول کو تاکید کے ساتھ بیان کرنے میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔ مسلمانوں کو موجودہ حالات میں قرآن کریم کے اس بنیادی اصول کو یاد دلانے کی ضرورت ہے‘ جس میں فرمایا گیا ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا.....﴾ ’’اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں.....‘‘

چنانچہ جس کے ضعیف اور بیمار والدین ہوں اُسے بھی اس قاعدے کو یاد رکھنے کی ضرورت ہے۔

جو آدمی حصولِ علم کی خاطر نکلا ہو اور اُسے ضروریاتِ زندگی پوری کرنے میں پریشانی ہو‘ اُسے بھی اِس اصول پر غور کرنا چاہیے۔

جس آدمی نے اپنے کچھ وقت کو نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کے لیے فارغ کر لیا ہو یا وہ مسلمان بچوں یا بچیوں کو قرآن کی تعلیم دینے میں مصروف ہو اور اُس کے جذبے میں کمی آ گئی ہو‘ اُسے بھی اِس اصول پر غور کرنا لازم ہے۔

آخری بات یہ ہے کہ جس کسی نے اپنے آپ کو نیک کام میں لگایا ہو‘ چاہے اس کا فائدہ اس کی اپنی ذات کے لیے ہو یا اس کا فائدہ دوسروں تک پہنچتا ہو‘ اُسے اِس اصول پر بہت زیادہ غور کرنے کی اَشد ضرورت ہے۔ اپنے رب کی طرف سفر کرنے والے کے لیے یہ بہترین مرہم ہے۔ اور وہ دن بھی دور نہیں کہ جب مؤمن اُن تمام تکالیف کو بھول جائے گا جو اُسے اِس راہ میں پہنچی ہوں گی‘ جس وقت وہ اپنا قدم جنت کی پہلی دہلیز پر رکھے گا۔

اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو‘ ہمارے والدین اور ہماری نسل کو اس جنت کا حقدار بنائے اور اس بات کا بھی حقدار بنائے کہ ہمیں جنت میں داخلے کے لیے پکارا جائے۔ آمین!

(جاری ہے)

فضائلِ اخلاق

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

رسول اللہ ﷺ انسانوں کو اچھے انسان بنانے آئے تھے کہ انسانوں میں وہ صفات پیدا ہو جائیں جو انسانیت کے شایانِ شان ہوں۔ ایسی صفات ہی فضائل اخلاق ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے مقاصدِ بعثت میں سے یہ بھی ہے کہ وہ انسانوں کا تزکیہ کریں‘ یعنی انسانوں کو سچی تعلیم وتربیت کے ذریعے اعلیٰ کردار وعمل کے افراد بنائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’میں اس واسطے بھیجا گیا ہوں کہ اخلاقی خوبیوں کو کمال تک پہنچاؤں۔‘‘ (مسند امام احمد عن ابی ہریرہؓ) چنانچہ آپؐ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اخلاقی خوبیوں سے مزین ہوئے اور خوش اخلاقی کی اعلیٰ مثالیں چھوڑ گئے۔ بااخلاق انسان دنیا کی زندگی میں اطمینان وسکون پاتا ہے اور آخرت میں اسے ارحمُ الرّاحمین کی رضا نصیب ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات میں فضائل اخلاق کی بہت اہمیت بیان کی گئی ہے۔ فضائلِ اخلاق سے مزیّن شخص ناخوشگوار معاشرے میں بھی عزت ووقار حاصل کر لیتا ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ ظہورِ نبوت سے پہلے کی زندگی میں بھی اعلیٰ اخلاق کے مالک تھے کہ لوگ آپؐ کو صادق اور امین کے القاب سے پکارتے تھے۔ پس اچھے انسان کی خوبیوں میں حسنِ اخلاق سب سے بڑی خوبی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ’’تم میں سب سے اچھے وہ لوگ ہیں جن کے اخلاق اچھے ہیں‘‘۔ (متفق علیہ‘ عن عبداللہ بن عمروؓ) تمام اہلِ ایمان آپ ﷺ کے اُمتی ہیں‘ لیکن ایمان کا سب سے اعلیٰ درجہ اُس شخص کو حاصل ہے جس کا اخلاق اچھا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’ایمان والوں میں زیادہ کامل ایمان والے وہ لوگ ہیں جو اخلاق میں زیادہ اچھے ہیں۔‘‘ (ابوداؤد عن ابی ہریرہؓ)

قیامت کے روز اعمال کا وزن ہوگا‘ اچھے اعمال اور برے اعمال تولے جائیں گے۔ جن خوش نصیب اہلِ ایمان کے نیک اعمال وزن دار ہوں گے وہ کامیاب وکامران ہوں گے۔ چنانچہ حسنِ اخلاق نیکیوں کا پلڑا بھاری کر دے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’قیامت کے دن

مؤمن کی میزانِ عمل میں سب سے زیادہ وزنی اور بھاری چیز جو رکھی جائے گی وہ اس کے اچھے اخلاق ہوں گے۔‘‘ (ترمذی‘ عن ابی الدرداءؓ)

بااخلاق وہ مؤمن ہے جس کے کردار وعمل سے شرافت ونجابت جھلکتی ہو وہ اپنی اچھی عادات کے سبب لوگوں میں ہر دل عزیز ہو۔ وہ کسی کے لیے تکلیف کا باعث نہ ہو بلکہ دوسروں کی تکلیف اسے پریشان کر دے اور وہ ان کی تکلیف دور کرنے میں لگ جائے۔ یہی مطلب ہے رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کا کہ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں۔ وہ دوسروں کا خیر خواہ ہو۔ پس جس کو حسنِ اخلاق کی نعمت مل گئی یوں سمجھئے کہ وہ خوش نصیب انسان ہے۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے حسنِ اخلاق کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ حسن اخلاق کشادہ روئی (اختیار کرنے) خوب بھلائی کرنے اور دوسروں کو تکلیف دینے سے بچنے کا نام ہے۔ حسن اخلاق کی فضیلت بیان کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا: ’’صاحب ایمان بندہ اپنے اچھے اخلاق سے ان لوگوں کا درجہ حاصل کر لیتا ہے جو رات بھر نفلی نمازیں پڑھتے ہوں اور دن کو ہمیشہ روزہ رکھتے ہوں‘‘۔ (ابوداؤد‘ عن عائشہؓ)

اخلاقی خوبیاں انسانیت کا زیور ہیں۔ یہی انسان کو شرف عطا کر کے دوسری مخلوق سے ممتاز کرتی ہیں۔ پوچھا گیا حضور ﷺ! انسان کو جو کچھ دیا گیا ہے اس میں سب سے بہتر کیا ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ’’اچھے اخلاق‘‘۔ (ابن ماجہ‘ عن اسامہ بن شریک) اسلام میں ایمان اور اخلاق کا گہرا تعلق ہے۔ ایمان اسلام کے بنیادی عقائد کو ماننے کا نام ہے۔ جس شخص کا ایمان کامل ہوگا اس کا کردار بھی اچھا ہوگا‘ کیونکہ ایمانیات میں آخرت پر یقین کی اہمیت واضح ہے۔ چنانچہ جس شخص کے سامنے یوم الدین کا محاسبہ مستحضر ہوگا وہ ہر اُس کام سے بچے گا جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا باعث ہوگا۔ پس جو لوگ حسنِ اخلاق سے مزیّن ہیں وہ رسول اللہ ﷺ کے پیارے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’تم دوستوں میں مجھے زیادہ محبوب وہ ہیں جن کے اخلاق زیادہ اچھے ہیں۔‘‘ (صحیح بخاری‘ عن عبداللہ بن عمروؓ) آپ ﷺ اپنے صحابہ کو جا بجا اخلاقی خوبیاں اپنانے کی تلقین کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے اپنی حیاتِ طیبہ کے آخری دور میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا۔ حضرت معاذؓ کہتے ہیں کہ جب میں نے رکاب میں پاؤں رکھا تو آخری وصیت جو رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمائی‘ وہ یہ تھی کہ اے معاذ! لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آنا۔ (مؤطا امام مالک) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’تم دوستوں میں مجھے زیادہ محبوب وہ ہیں اور قیامت کے دن ان ہی کی نشست بھی میرے زیادہ قریب ہوگی جن

کے اخلاق تم میں زیادہ بہتر ہیں۔'' (ترمذی عن جابرؓ)

رسول اللہ ﷺ کے فرامین کی روشنی میں خوش اخلاقی کی مظہر چند ایک باتوں کا ذکر کیا جاتا ہے تاکہ ہر شخص اپنا جائزہ لے سکے کہ وہ اس سلسلہ میں کہاں کھڑا ہے اور فضائلِ اخلاق حاصل کرنے کے لیے اسے کن کن عادات کو اپنانا ضروری ہے تاکہ وہ دنیا میں ہر دلعزیز بن سکے اور آخرت میں کامیاب و کامران ہو سکے' یعنی جنت میں جانے والا بن جائے۔

انسان کو معاشرے میں دوسرے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ چنانچہ نبی مکرم ﷺ کی ہدایت یہ ہے کہ اپنے لین دین اور معاملات میں رحم دلی کا طریقہ اپنایا جائے اور دوسروں پر بے جا سختی نہ کی جائے۔ رحم دلی کے رویے کا انجام بتاتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا: ''رحم کرنے والوں اور ترس کھانے والوں پر رحمٰن رحم کرے گا۔ تم زمین پر بسنے والی اللہ کی مخلوق پر رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم کرے گا''۔ (جامع ترمذی' عن عبداللہؓ بن عمرو بن العاص) اس حدیث کا ترجمہ بصورتِ شعر یوں کیا گیا ہے:

کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر　　خدا مہرباں ہو گا عرشِ بریں پر!

اس سے معلوم ہوا کہ رحم کا وطیرہ صرف انسانوں کے لیے نہیں' بلکہ اللہ کی مخلوق چرند پرند بھی رحم کے مستحق ہیں۔ یہ رحم دلی کا تقاضا ہے کہ کسی مصیبت زدہ کو دیکھ کر آدمی بے چین ہو جائے اور اس کی مدد کے لیے آمادہ ہو جائے۔ سچ تو یہ ہے کہ جس شخص میں یہ جذبہ نہیں اس کی انسانیت میں نقص ہے۔ بخاری اور مسلم کی ایک روایت کا خلاصہ اس طرح ہے کہ ایک آدمی کو چلتے چلتے سخت پیاس لگی۔ اسے ایک کنواں مل گیا تو اس نے وہاں سے پانی پیا۔ دیکھا تو وہاں ایک کُتّا پیاس سے بے کل ہے اور گیلی مٹی چاٹ رہا ہے۔ آدمی کے دل میں رحم آیا' وہ کنویں میں اترا' اپنے چمڑے کے موزے میں پانی بھر کر لایا اور اس پیاسے کُتّے کو پلایا۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس رحم دلی کی وجہ سے اس شخص کی بخشش کر دی۔

رسول اللہ ﷺ ایک انصاری کے باغ میں تشریف لے گئے۔ وہاں ایک اونٹ تھا' جب اس اونٹ نے آپؐ کو دیکھا تو ایسی درد بھری آواز نکالی جیسی بچے کے جدا ہو جانے پر اونٹنی کی آواز نکلتی ہے اور اس کی آنکھوں سے آنسو بھی جاری ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ اس کے قریب تشریف لے گئے اور آپؐ نے اس کی کنوتیوں پر اپنا دستِ شفقت پھیرا۔ وہ اونٹ خاموش ہو گیا۔ پھر آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: یہ اونٹ کس کا ہے؟ اس کا مالک کون ہے؟ ایک

انصاری نوجوان آیا اور عرض کیا یہ اونٹ میرا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس بے زبان جانور کے بارے میں تم اللہ سے نہیں ڈرتے' جس نے تم کو اس کا مالک بنایا ہے؟ اس نے مجھ سے شکایت کی ہے کہ تم اس کو بھوکا رکھتے ہو اور زیادہ کام لے کر اس کو بہت دکھ پہنچاتے ہو۔ (سنن ابی داؤد' عن عبداللہ بن محضرؓ) گویا کسی بے زبان جانور کو تکلیف میں دیکھ کر اس کی تکلیف دور کرنا اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے' کیونکہ ہر ذی روح اللہ کے کنبے کا فرد ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے: ((اَلْخَلْقُ عَيَالُ اللّٰهِ)) ''ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔''

ضرورت مندوں اور محتاجوں کی مدد کرنا بھی رحم دلی کا مظہر ہے۔ رسول اللہ ﷺ کسی ضرورت مند سائل کو خالی ہاتھ نہ لوٹاتے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ رسول اللہ ﷺ سے کسی چیز کا سوال کیا گیا ہو اور آپؐ نے جواب میں نہیں کہا ہو۔ (صحیح بخاری' صحیح مسلم) اگر سائل کی ضرورت پوری کرنے کے لیے آپ ﷺ کے پاس کچھ نہ ہوتا تو قرض لے کر اس کی مدد کر دیتے۔

قصور وار کو معاف کر دینا ایک اعلیٰ اخلاقی خوبی ہے۔ اگرچہ انصاف کے ساتھ بدلہ لینا جائز ہے لیکن اللہ کا جو بندہ انتقام لینے کی استطاعت رکھتا ہو مگر وہ انتقام نہ لے اور معاف کر دے اور صلح اور اصلاح کی کوشش کرے تو اس کا خاص اجر و ثواب اللہ کے ذمہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی جناب میں عرض کیا: پروردگار! آپ کے بندوں میں کون آپ کی بارگاہ میں زیادہ باعزت ہے؟ ارشاد فرمایا: وہ بندے جو قابو پانے کے بعد خطا کار کو معاف کر دیں''۔ (شعب الایمان للبیہقی' عن ابی ہریرہؓ) قصور وار کو معاف کرنا بڑی جواں مردی کا کام ہے' لیکن کوئی شخص اگر اللہ کی حدود کو توڑے تو اس کو سزا دی جائے گی۔

گھر کے نوکر چاکر یا ماتحت ملازموں کے ساتھ بھی نرمی کا سلوک پسندیدہ ہے۔ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: یارسول اللہ! میں اپنے خادم کا قصور کتنی دفعہ معاف کروں؟ آپؐ نے اس کو کوئی جواب نہیں دیا اور خاموش رہے۔ اس نے پھر وہی عرض کیا کہ یارسول اللہ میں اپنے خادم کو کتنی دفعہ معاف کروں؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''ہر روز ستّر دفعہ''۔ (جامع ترمذی' عن عبداللہ بن عمرؓ)

نبی محترم ﷺ نے خوش اخلاقی کی تعلیم پر بڑا زور دیا اور خود خوش اخلاقی کی اعلیٰ مثالیں قائم کیں۔ پس مسلمان کی شان بھی یہی ہے کہ وہ اخلاق کا اچھا ہو اور اس کا اخلاق دوسروں پر اچھا اثر ڈالے۔ ooo

مسلمانوں کا عروج وزوال

سید ابوالحسن علی ندویؒ

کی کتاب ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر'' کے حوالے سے

تحریر: سید وجاہت علی ☆

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہر کتاب ہی اُن کا بہترین ادبی اور تخلیقی شہ پارہ ہے۔ اُن کی تحریروں میں ہمیں اُن کے قلم کی روانی، دل کا خلوص ولگن اور توازن واعتدال نظر آتا ہے۔ اُن کا ایک عظیم علمی کارنامہ اُن کی کتاب ''ماذا خسر العالم بانحطاط المُسلمین'' ہے، جو عالمِ عرب میں بہت مقبول ہوئی۔ مصنف ہی نے اِس کتاب کا اُردو زبان میں ترجمہ کیا اور ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر'' کے نام سے یہ کتاب اُردو میں طبع ہوئی۔ مذکورہ کتاب میں اُن کا وہی دل آویز اسلوب ہے—— اُمت کے زوال سے مسلمانوں کے علاوہ باقی دنیا کو کیا عظیم نقصان ہوا؟ اِس خسارے کا تخمینہ انہوں نے اپنے وقت کی اعلیٰ علمی سطح کے سامنے پیش کیا ہے۔ مولانا ندویؒ لکھتے ہیں:

> ''پیشِ نظر کتاب کا ابتدائی تخیل ایک مضمون سے زیادہ نہ تھا۔ ابتدا میں خیال تھا کہ اجمالی طور پر اُن نقصانات کی نشان دہی کی جائے جو مسلمانوں کے تنزل وزوال اور دنیا کی قیادت ورہنمائی سے کنارا کش ہوجانے سے انسانیت کو پہونچے اور دکھایا جائے کہ زندگی کے نقشے میں اُن کی جگہ اور قوموں کی صف میں اُن کا مقام کیا ہے؟ اِس کا مقصد اِس کے سوا کچھ نہ تھا کہ مسلمانوں کو اُس مجرمانہ کوتاہی کا احساس ہو جو انہوں نے انسانیت کے حق میں کی اور اِس کی تلافی اور اصلاحِ احوال کا جذبہ اُن کے اندر پیدا ہو۔ اسی کے ساتھ دنیا کو بھی اُس بدقسمتی کا علم ہو جس سے اُس کو مسلمانوں کی قیادت سے محروم ہوجانے کی بنا پر دوچار ہونا پڑا اور اس کو محسوس ہو کہ حالات میں کوئی بڑی تبدیلی اُس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک کہ دنیا کی قیادت مادّہ پرست اور ناخدا ترس

☆ لطیف آباد نمبر 11 حیدرآباد، رابطہ: 0332 2671956

> انسانوں کے ہاتھ سے نکل کر اُن خدا شناس اور خدا ترس انسانوں کے ہاتھ میں نہ پہونچ جائے جو پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہیں اور اُنہیں کی ہدایات اور تعلیمات سے روشنی اور رہنمائی حاصل کرتے ہیں اور اُن کے پاس آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت اور دین ودنیا کی رہنمائی کا مکمل دستور موجود ہے۔''

مسلمان اِس دنیا کے امام تھے۔ ایک ہزار سال سے زیادہ انہوں نے دنیا کی قیادت کی۔ اُن کے اَسلاف شمشیر وسناں کی تعبیر تھے اور اَخلاف طاؤس ورباب کی تصویر بن گئے۔ نتیجتاً زوال اُن کا مقدر ٹھہرا اور عالمی قیادت ان کے ہاتھ سے نکل گئی۔ دنیا کا رخ دوبارہ ہمہ گیر خدافراموشی اور جاہلیت (جدیدہ) کی طرف پھر گیا۔ دنیا کی قیادت کمزور، غافل خداشناسوں کے ہاتھ سے نکل کر طاقتور ناخداشناس اور مادّہ پرست مغرب ویورپ کی طرف منتقل ہوگئی۔ دنیا میں جاہلیتِ جدیدہ کا، جس کے سرکردہ سرغنے ڈارون، فرائیڈ، میکڈوگل، ایڈلر، مارکس، میکاوَلی اور کیرک گارڈ ہیں، سیلاب آ گیا، جو اپنے ساتھ تمام اعلیٰ انسانی اقدار بہا کے لے گیا۔ پھر ایسے انسان سامنے آئے کہ جنگل کے درندے بھی انہیں دیکھ کر شرمندہ ہوجائیں۔

ڈارون نے نظریہ پیش کیا کہ انسان کی اصل حیوانیت ہے۔ میکڈوگل کے بقول انسان اپنی جبلتوں کو پورا کرنے کے لیے جیتے ہیں، یہی ان کا واحد مقصدِ حیات ہے۔ فرائیڈ کے خیال میں انسانی زندگی کا مقصد جنسی خواہشات کی تکمیل ہے، اس لیے انسان کو جنسی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے لامحدود آزادی ہونی چاہیے، بصورتِ دیگر وہ نفسیاتی عوارض میں مبتلا ہوجائیں گے۔ ایڈلر نے سمجھایا کہ حُبِّ تفوق اور بالادستی کی آرزو انسان کے افعال کی محرک ہے۔ مارکس نے جتلایا کہ معاش انسانی زندگی کی اساس ہے، چنانچہ زندگی کا مقصد زیادہ سے زیادہ نفع کا حصول (maximization of profit) ٹھہرا۔ میکاوَلی نے خیال آرائی کی کہ انسان کو اپنی قوم اور ملک کا بندہ ہونا چاہیے۔ قومی اور ملکی زندگی ہی انسان کا محور ہے۔ ایک قوم اپنی سربلندی کے لیے جو وہ چاہتی ہے، کرگزرے، چاہے وہ اخلاقی اعتبار سے کتنا ہی پست اور تباہ کُن نتائج کا حامل ہو۔ کمزور گروہوں اور قوموں کو جینے کا حق نہیں۔ قوموں کی سیاست میں مذہب واخلاقیات بچکانہ باتیں ہیں۔ وجودی فلسفے جس کا بانی کیرک گارڈ تھا، کے ہمنواؤں نے خواہش ظاہر کی کہ کسی بھی فرد کو کسی بھی کام کے لیے مکمل آزادی ہونی چاہیے۔ فرد بذاتِ خود طے کرے گا کہ کون سا عمل اس کے لیے اچھا ہے اور کون سا بُرا؟ منطقی ثبوتیت کا یہ نتیجہ نکلا کہ صرف حسیاتِ طبعی اور عقل کے تجربے وتجزیے سے ثابت ہونے والی چیزیں ہی یقینی قرار پائیں

اور بقیہ امور کے متعلق انکار یا غیر جانب داری (جو انکار ہی کی شکل تھی) کا رویہ اپنا لیا گیا۔

ان سارے نظریات (جو علم وحی کی روشنی سے تہی دامن تھے) کا آمیزہ تیار کیا گیا تو پھر انسان نہیں بلکہ خون آشام بھیڑیے تیار ہوئے۔ یہی ''اسفل سافلین'' کی تشریح ہیں۔ یہ سب اس لیے ہوا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے عالمی قیادت خود ان کے قول و فعل کے سبب نکل گئی۔

سیدنا عیسیٰ علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت تک تقریباً چھ سو سال کا عرصہ بنتا ہے۔ ان چھ صدیوں میں دنیا میں کوئی نبی یا رسول نہیں آئے۔ یہ چھ بدقسمت صدیاں تھیں۔ خاص طور پر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی ولادتِ باسعادت سے پہلے کے دو سو برس انتہائی تاریک تھے۔ جہالت اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی اور روشنی کی کوئی کرن نظر نہیں آ رہی تھی۔ انسانیت اُس عظیم پیغمبر انقلاب ﷺ کی راہ تک رہی تھی جن کے آنے کی نوید سیدنا مسیح علیہ السلام اور دیگر تمام انبیاء کرام علیہم السلام دیتے آئے تھے۔ قافلے مسلسل خزاں میں سفر کر کر کے تھک گئے تھے اور اب بہاروں کو ڈھونڈ رہے تھے۔

آیۂ کائنات کا معنی دیریاب تو نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو!

مولانا ندویؒ کے الفاظ میں:

''ایسے وقت میں کہ انسانیت پر نزع کا عالَم طاری تھا' دنیا اپنے تمام ساز و سامان کے ساتھ ہلاکت کے مہیب و عمیق غار میں گرنے والی تھی۔ عین وقت پر اللہ تعالیٰ نے حضور محمد رسول اللہ ﷺ کو وحی و رسالت کے ساتھ مبعوث فرمایا۔''

یہ اللہ بزرگ و برتر کا اس کائنات پر عظیم ترین احسان ہے۔ حضور ﷺ نے تاریخ انسانی کا ایسا عظیم انقلاب برپا فرمایا کہ عقلیں عاجز ہو گئیں۔ ایسا ہمہ گیر انقلاب کہ سب کچھ ہی بدل گیا۔ عقائد' عبادات' رسومات' معاشرت' معاشیات' سیاست' اخلاقیات۔ ایسا حسین انقلاب انسانیت نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ساتھ ہی عرب کے صحرانشین' پیغمبر انقلاب ﷺ کی تعلیمات کی بدولت دنیا کے حکمران بن گئے۔ ان کی آخرت بھی سنور گئی کہ ان کے ناموں کے ساتھ 'رضی اللہ عنہ' لگ گیا اور دنیا میں بھی انہیں سیادت اور عروج نصیب ہوا۔ اللہ کے رسول ﷺ کے دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد خلافت راشدہ کا سنہری دور شروع ہوا۔ ایسا تابناک دور جو کسی خوبصورت خواب کی طرح نوعِ انسانی کے اجتماعی شعور میں بس گیا۔ خلافتِ راشدہ کا دور محض مسلمانوں کا ہی نہیں' بلکہ پوری انسانیت کا مشترکہ خواب (combined nostalgia) ہے۔

ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو!

خلافتِ راشدہ کے بعد بنوامیہ کے دور کا آغاز ہوا۔ مسلم سلطنت وسیع ہوتی گئی۔ اسلام سندھ سے لے کر جزیرہ نما آئبیریا (سپین) تک پھیل گیا۔ بنوامیہ کے بعد بنوعباس برسرِ اقتدار آئے۔ وہ پانچ سو سال کے لگ بھگ مسند نشین رہے۔ آخر ۶۵۶ ہجری میں ان کی سلطنت کا خاتمہ بڑے دردناک انداز میں ہوا۔

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں
بر زوالِ مُلکِ مستعصم امیر المؤمنیں

بنوعباس کے دور میں ہی چھوٹی چھوٹی خودمختار سلطنتیں پیدا ہو چکی تھیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان پر بھی زوال طاری ہوتا گیا۔ جب بنوعباس سریر آرائے سلطنت ہوئے تو ہسپانیہ میں عباسی سلطنت کے متوازی ایک اموی حکومت بن چکی تھی۔ وہ ہسپانیہ جس کو طارق بن زیاد نے فتح کیا اور جہاں عبدالرحمٰن الداخل نے بنوامیہ کا اقتدار قائم کیا تھا' اس گلستانِ اندلس سے ۱۴۹۲ عیسوی میں مسلمان بے دخل ہو گئے۔ غرناطہ' اشبیلیہ' طلیطلہ ان سے چھن چکے تھے۔ قرطبہ کی مسجد اذانوں سے محروم ہو گئی اور کوہ سیرانویدا کی برف پوش چوٹیوں میں مسلمانوں کی عظمت کا سورج ڈوب گیا تھا۔

اشک باری کے بہانے ہیں یہ اجڑے بام و در
گریۂ پیہم سے بینا ہے ہماری چشمِ تر
دہر کو دیتے ہیں موتی دیدۂ گریاں کے ہم
آخری بادل ہیں اِک گزرے ہوئے طوفاں کے ہم!

بنوعباس کے بعد سلطنتِ عثمانیہ دنیا کے نقشے پر ابھری۔ عثمانی سلاطین کے ہم عصر ایران کے صفوی اور ہند کے مغل تھے۔ سب سے پہلے صفویوں کا خاتمہ ہوا۔ اس کے بعد ۱۸۵۷ عیسوی میں مغل محروم تخت ہوئے اور بالآخر ۱۹۲۴ء میں خلافتِ عثمانیہ بھی ختم ہو گئی۔ تب سے مسلمان مغلوب ہیں اور جاہلیتِ جدیدہ کی علم بردار اقوامِ مغرب ہی دنیا میں غالب ہیں۔

مسلمانوں پر زوال کیوں آیا؟ اس کا سیدھا سادا اور بنیادی جواب یہی ہے کہ انھوں نے اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی تعلیمات کو چھوڑ دیا' قرآن سے بے وفائی کی' نتیجتاً ذلت و مسکنت ان پر مسلط کر دی گئی۔ مسلمانوں کے عروج و زوال میں سائنس و فن کو اہمیت نہیں رہی۔

ان کا عروج وزوال اللہ اور اُس کے رسول ﷺ سے وفاداری سے مشروط ہے۔

اسلام اور مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے لیے لازم ہے کہ تجدید ایمان کی ایک تحریک برپا ہو۔ مفکّر اسلام سید ابوالحسن علی ندویؒ بھی اسی نتیجے پر پہنچے ہیں:

''عالمِ اسلام کو اس مقدس فریضے کو ادا کرنے کے لیے معنوی تیاری اور اندرونی تبدیلی کی بھی ضرورت ہوگی۔ ظاہر ہے کہ عالمِ اسلام خدا ناشناس یورپ کا مقابلہ تمدن و تہذیب کے کھوکھلے مظاہر، مغربی زبانوں کی مہارت اور زندگی کے اس رنگ ڈھنگ کو اختیار کر لینے سے نہیں کرسکتا جس کو قوموں کی ترقی میں کوئی دخل نہیں۔ وہ اپنا پیغام اس روح اور معنوی طاقت ہی کی مدد سے پہونچا سکتا ہے، جس میں یورپ روز بروز دیوالیہ ہوتا جارہا ہے۔ عالمِ اسلام اپنے مدمقابل پر اسی صورت میں غلبہ حاصل کرسکتا ہے کہ وہ اپنے حریف سے ایمان میں فائق ہو، زندگی کی محبت اس کے دل سے نکل چکی ہو، خواہشاتِ نفسانی کے بند سے آزاد ہو چکا ہو، اس کے افراد شہادت کے حریص ہوں، جنت کا شوق ان کے دلوں میں چٹکیاں لیتا ہو، فانی مال ومتاع ان کے دل میں وقعت نہ رکھتا ہو، اللہ کے راستے کی تکلیفیں وہ ہنسی خوشی برداشت کرتے ہوں۔ درحقیقت ایک خدا ناشناس منکرِ آخرت کے مقابلہ میں مؤمن کا یہ امتیاز ہے، اور اسی بنا پر اس سے یہ توقع کی گئی ہے کہ اس میں برداشت کی قوت زیادہ ہوگی۔''

مزید فرماتے ہیں:

''واقعہ یہ ہے کہ مؤمن کی طاقت اور اس کے فتح و غلبے کا راز یہ ہے کہ اس کو آخرت کا یقین اور اللہ کے اجر وثواب کی امید ہوتی ہے۔ اگر عالم اسلامی کے سامنے بھی تمام تر وہی دنیاوی مقاصد اور مادی منافع ہیں، اور وہ بھی محض محسوسات و مادیات کے طلسم میں گرفتار ہے، تو یورپ کو اپنی مادّی طاقت، صدیوں کی تیاری اور وسیع تر ساز وسامان کی بنا پر غلبہ کا زیادہ حق ہے۔''

پھر مولانا ندویؒ عالمِ اسلام کی جماعتوں اور مفکّرین کو مشورہ دیتے ہیں:

''آج عالم اسلامی کے قائدین ومفکّرین اور اُس کی جماعتوں اور حکومتوں کے لیے کرنے کا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کا تخم دوبارہ بونے کی کوشش کریں، جذبہ دینی کو پھر متحرک کریں، اور پہلی اسلامی دعوت کے اصول اور طریق کار کے مطابق مسلمانوں کو ایمان کی دعوت دیں اور اللہ ورسول اور آخرت کے عقیدے کی پوری طرح تبلیغ وتلقین کریں، اس کے لیے وہ سب طریقے اختیار کریں جو اسلام کے

ابتدائی داعیوں نے اختیار کیے تھے، نیز وہ تمام وسائل اور طاقتیں کام میں لائیں جو عصرِ جدید نے پیدا کردی ہیں۔''

''قرآن مجید اور رسول اللہ ﷺ کی سیرت اب بھی زندگی اور طاقت کا ایسا سرچشمہ ہے جس سے عالمِ اسلام کی خشک رگوں میں زندگی کا گرم اور تازہ خون پھر دوڑ سکتا ہے۔ ان کے مطالعہ اور اثر سے اس جاہلی دنیا کے خلاف بغاوت کا جذبہ ابھرتا ہے، اور ان کی تاثیر سے ایک اونگھتی سوتی قوم ایک پُرجوش، بے چین اور سرگرم عمل قوم بن جاتی ہے۔''

اسلام اور مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے لیے تجدید ایمان کی ایک تحریک ناگزیر ہے۔ جدیدیت، مادّیت، منطقی ثبوتیت اور دیگر خدا بیزار اور گمراہ کن فلسفوں کے اس دور میں جب کہ نظریں دیکھے کو مانتی ہیں اور اَن دیکھے پر ان کا یقین نہیں ہے، لازم ہے کہ مسلمانوں کا اس ذاتِ اَقدس سے تعلق بن جائے جو پردۂ غیب میں ہے، لیکن اس کائنات کی حقیقتِ اولیٰ، حقیقتِ مطلق، دیکھے سے زیادہ یقینی اور فاعلِ حقیقی ہے اور جس کو مسلمان اللہ کہہ کر پکارتے ہیں۔ اللہ پر ایمان اور اُس کے ساتھ تعلق، رسول اللہ ﷺ پر ایمان اور آپ ﷺ کے ساتھ تعلق اور آخرت پر پکا ایمان اور یقین۔ اس تجدیدِ ایمان کے بغیر نشاۃ ثانیہ ہو جانا ناممکنات میں سے ہے۔ تجدیدِ ایمان کے سلسلے میں مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی حیثیت ایک مجدد کی سی ہے۔ انھوں نے تبلیغی جماعت کی بنیاد اٹھائی، جس کا بنیادی پیغام ہی یہ ہے کہ اللہ سے ہوتا ہے، اللہ کے غیر سے نہیں ہوتا۔ بھروسہ اسباب پر نہیں بلکہ مسبّبُ الاسباب پر ہونا چاہیے۔ جب اس امر کا یقین دل میں پیدا ہو جاتا ہے کہ پانی پیاس بجھانے میں اللہ کے حکم کا محتاج ہے، اللہ پیاس بجھانے میں پانی کا محتاج نہیں، کھانا بھوک مٹانے میں اللہ کے حکم کا محتاج ہے، اللہ بھوک مٹانے میں کھانے کا محتاج نہیں، تو پھر بے عملی اور بدعملی کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور وہی اَفعال سرزد ہونے لگتے ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے۔

جدیدیت، مادّیت اور دوسرے مذہب دشمن فلسفے آج کے صنم ہیں۔ مذکورہ بالا جملے تیشے ہیں جو ان بتوں کو توڑ دیں گے۔ ؎

خودی کا سِرِّ نہاں لا الٰہ الا اللہ
خودی ہے تیغ، فساں لا الٰہ الا اللہ
یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں، لا الٰہ الا اللہ
یہ نغمہ فصل گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں، لا الٰہ الا اللہ!

عوامی اور جذباتی سطح پر یہ کام تیزی سے ہو رہا ہے‘ لیکن علمی اور خواص کی سطح پر اس فریضے کو سرانجام دینے کے لیے ایک خون جگر والی تحریک کی ضرورت ہے۔ معاشرے کے ذہین طبقوں (intelligentsia) کے ذہنوں میں باطل فلسفے گھسے ہوئے ہیں۔ ان کا ابطال اسی صورت میں ممکن ہے کہ ایک تحریک اعلیٰ علمی سطح پر برپا ہو۔ اس تحریک میں شامل لوگ قرآن کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیں اور قرآنی فلسفے کو وقت کی اعلیٰ علمی سطح کے سامنے پیش کریں۔ اس طرح ذہین طبقوں (intelligentsia) کے حلقوں میں بھی تجدید ایمان کی تحریک برپا ہو جائے گی جو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔ ڈاکٹر اسرار احمد ؒ کے الفاظ میں:

”بنابریں وقت کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ ایک زبردست علمی تحریک ایسی اٹھے جو سوسائٹی کے اعلیٰ ترین طبقات یعنی معاشرے کے ذہین ترین عناصر کے فکر و نظر میں انقلاب برپا کر دے...... اور انہیں مادّیت و اِلحاد کے اندھیروں سے نکال کر ایمان و یقین کی روشنی میں لے آئے اور خدا پرستی و خود شناسی کی دولت سے مالا مال کر دے۔ خالص علمی سطح پر اسلامی اعتقادات کے مدلّل اثبات اور الحاد و مادہ پرستی کے پرزور ابطال کے بغیر اس تحریک کا سر ہونا ناممکن ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ موجودہ دور میں فاصلے بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں اور پوری نوع انسانی ایک کنبے کی حیثیت اختیار کر چکی ہے‘ لہٰذا علمی سطح کا تعین کسی ایک ملک کے اعتبار سے نہیں بلکہ پوری دنیا کے اعلیٰ ترین معیار کے مطابق کرنا ہوگا......“

ان شاء اللہ وہ دن ضرور آئے گا کہ جب ؎

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
اس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار
نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی!
شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے!
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے!!

❁❁❁

دارالعلوم دیوبند کے قیام کا مقصد
اور موجودہ مدارس کا کردار
تاریخی و تجزیاتی مطالعہ

پروفیسر محمد انس حسّان ☆

دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی دینی فراست اور علمی ذکاوت کا عملی نمونہ تھا۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد جب مسلمان انتہائی کس مپرسی کے عالم میں تھے' مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے ایک ایسے دینی مرکز کی نیو اٹھائی جس کا مقصد مسلمانوں کی مذہبی اَقدار کی حفاظت اور وقت کی جابر سلطنت یعنی حکومتِ برطانیہ کے خلاف ایسی جماعت تیار کرنا تھا جو مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کی یاد تازہ کردے۔ سید محبوب رضوی لکھتے ہیں:

''اس وقت بنیادی نقطۂ نظر یہ قرار پایا کہ مسلمانوں کے دینی شعور کو بیدار رکھنے اور ان کی ملی شیرازہ بندی کے لیے ایک دینی و علمی درسگاہ کا قیام ناگزیر ہے۔ چنانچہ طے ہوا کہ اب دہلی کی بجائے دیوبند میں یہ دینی درسگاہ قائم ہونی چاہیے۔''(۱)

حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کو جب بتایا گیا کہ دیوبند میں ایک مدرسہ قائم کیا گیا ہے تو اس پر آپ نے فرمایا:

''سبحان اللہ! آپ فرماتے ہیں ہم نے مدرسہ قائم کیا ہے۔ یہ خبر نہیں کہ کتنی پیشانیاں' اوقاتِ سحر میں سربسجود ہوکر گڑگڑاتی رہیں کہ خداوندا! ہندوستان میں بقاءِ اسلام اور تحفظِ علم کا کوئی ذریعہ پیدا کر۔ یہ مدرسہ ان ہی سحرگاہی دعاؤں کا ثمرہ ہے۔''(۲)

مولانا نانوتویؒ نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد کے نامساعد حالات میں جو طریقہ کار وضع کیا' اس کے بنیادی اصول اور مقاصد درج ذیل تھے:

☆ گورنمنٹ ڈگری کالج جہانیاں' پاکستان anskashmiri@gmail.com

(۱) شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے اسلوبِ تدریس کی اساس پر دینی علوم وفنون کی طرف دعوت دینا۔
(۲) عیسائیوں اور ہندوؤں کی جانب سے اسلام کے حوالے سے پھیلائے گئے شکوک وشبہات کا ازالہ کرنا۔
(۳) کتاب وسنت کو مسلم وغیر مسلم طبقات میں پھیلانے کے لیے جدوجہد اور کوشش کرنا۔
(۴) قابض اور مسلط حکومت سے تعاون لیے بغیر دین اسلام کی بیداری کے لیے اپنا مال اور جان خرچ کرنا۔
(۵) شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے فلسفے میں تجدید کرکے ہندوستان میں دین کے غلبے کی تحریک کو نئے رخ پر ڈالنا۔
(۶) قدیم علوم وفنون میں انتہائی عمیق غور وخوض کرکے اسے ہندوستان کے لوگوں کی ذہنیت کے قریب بنانا۔
(۷) ماہرینِ فلسفہ کی ''مخصوص اصطلاحات'' کو چھوڑ کر' عام ہندوستانیوں کی زبان میں بات کرنا۔
(۸) عدم تشدد کے اصول پر قائم رہتے ہوئے منظّم علمی وفکری شعور بیدار کرنا۔

ان اصول ومقاصد کے حصول کے لیے ہی دارالعلوم دیوبند قائم کیا گیا تھا۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ دارالعلوم کوئی رسمی علمی ادارہ نہیں تھا' بلکہ یہ اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ اگرچہ مولانا نانوتویؒ کے وصال کے کچھ عرصہ بعد ہی دارالعلوم کے مقاصد کی تعیین کے حوالے سے معروضی بحث کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا اور بعض اکابرین کی رائے یہ تھی کہ دارالعلوم کو محض تعلیم وتعلّم تک محدود رکھنا مناسب ہوگا کیونکہ یہی اس کی علتِ غائی تھی۔ تاہم بعض اکابرین کی رائے یہ تھی دارالعلوم کا مقصد محض تعلیم وتعلّم ہی نہیں تھا بلکہ قومی وسیاسی نوعیت کے گھمبیر مسائل سے نبرد آزما ہونے اور حکومتِ برطانیہ سے آزادی کے حصول کے لیے منظّم جماعت تیار کرنا تھا۔ مولانا نانوتویؒ خود فرماتے ہیں:

''ہم نے دارالعلوم کے اصل مقصد پر درس وتدریس' علومِ اسلامی کا پردہ ڈال دیا ہے۔''(۳)

چنانچہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ (جو کہ اس مدرسہ کے سب سے پہلے طالب علم تھے) نے ایک موقع پر فرمایا تھا:

''حضرت الاستاذ نے اس مدرسہ کو کیا درس وتدریس' تعلیم وتعلّم کے لیے قائم کیا تھا؟ مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا' جہاں تک میں جانتا ہوں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی ناکامی کے بعد یہ ارادہ کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے' جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا

جائے تا کہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے۔‘‘(۴)

حضرت شیخ الہندؒ نے مزید فرمایا:

’’تعلیم وتعلّم، درس وتدریس جن کا مقصد اور نصب العین ہے، میں ان کی راہ میں مزاحم نہیں ہوں، لیکن خود اپنے لیے تو اسی راہ کا میں نے انتخاب کیا ہے، جس کے لیے دارالعلوم کا یہ نظام میرے نزدیک حضرت الاستاذ نے قائم کیا تھا۔‘‘(۵)

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ دارالعلوم کے قیام کے پس منظر کے بارے میں لکھتے ہیں:

’’جس وقت شاملی کے میدان سے وہ خود (مولانا نانوتویؒ) اور ان کے رفقائے کار بظاہر ناکامی کے ساتھ واپس ہوئے تو یقیناً ان کی یہ واپسی یاس ونامرادی کی واپسی نہ تھی اور نہ ہوسکتی تھی۔ واپس تو وہ بیشک ہوئے تھے لیکن یقیناً یہ واپسی مُتَحَرِّفاً لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ (الانفال) ’’جنگ ہی کے لیے کتراتے ہوئے یا کسی ٹولی سے ملنے کے لیے‘‘ ہوسکتی تھی اور یقیناً اسی کے لیے تھی۔‘‘(۶)

آگے چل کر دارالعلوم کے قیام کو انگریز سامراج کے خلاف نئے محاذ اور میدان کی تیاری سے تعبیر کرتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

’’۱۸۵۷ء کی کشمکش کی ناکامی کے بعد قتال اور آویزش کے نئے محاذوں اور میدانوں کی تیاری میں آپ (حضرت نانوتویؒ) کا دماغ مصروف ہوگیا۔ دارالعلوم دیوبند کا تعلیمی نظام اس لائحہ عمل کا سب سے زیادہ نمایاں اور مرکزی وجوہری عنصر تھا۔‘‘(۷)

دیوبند مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے حضرات کو موجودہ دَور کے تناظر میں دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(ا) پہلا طبقہ وہ ہے جو دارالعلوم کو محض ایک رسمی تعلیمی ادارے کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اکابرینِ علماء دیوبند کا حقیقی تعارف اور ان کی مساعی جمیلہ کا شعور نئی نسل میں منتقل کرنا ان کے مقاصد سے خارج ہے۔

(ب) دوسرا طبقہ وہ ہے جو تحریک بالاکوٹ اور معرکہ شاملی جیسی عسکری مثالوں کو اکابرین دیوبند کی سنت قرار دیتے ہوئے فی زمانہ غلبۂ دین کے لیے عسکری طریقہ کار اختیار کرنے کو ترجیح دیتا ہے۔ شیخ الہندؒ کی قائم کردہ جمعیۃ علماء ہند کی پالیسی ان کی نظر میں بے معنی ہے۔

ہمارے خیال میں یہ دونوں مکاتب فکر دارالعلوم دیوبند کے مقاصد سے کما حقہ آگاہی نہیں رکھتے۔ چنانچہ پہلا طبقہ تو محض اپنے مدارس کی چار دیواری اور اس سے بھی بڑھ کر اپنی

موروثی شہنشاہیت اور امارت قائم رکھنے کے لیے نئی نسل کو بے شعور رکھنا چاہتا ہے، جبکہ دوسرا طبقہ اپنی کم علمی اور بے شعوری کے باعث غلبۂ دین کے لیے تشدد کا راستہ اختیار کرتا ہے، حالانکہ یہ بات آشکار ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ نے مولانا نانوتویؒ کے مقاصد کے حصول کے لیے عدم تشدد کے اصول پر پُرامن جِدّوجُہد کا طریقہ اختیار کیا تھا اور اسی مقصد کے تحت جمعیۃ علماء ہند کا قیام عمل میں آیا تھا۔

بدقسمتی سے ہمارے مدارس میں تاریخ ومقاصدِ دیوبند کے حوالے سے کچھ زیادہ آگاہی نہیں دی جاتی۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہمارے مدارس اس نظریاتی دیوبند سے دور ہوتے جارہے ہیں جس کی بنیاد مولانا نانوتویؒ نے رکھی تھی۔ چنانچہ آج یہ بات شدت سے محسوس کی جارہی ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ اس کا تقاضا پیدا ہورہا ہے کہ ہم جائزہ لیں کہ کیا ہمارے مدارس مولانا نانوتویؒ کے وضع کردہ اصولوں پر چل رہے ہیں یا نہیں؟

یقیناً اس گئے گزرے دور میں قال اللّٰہ وقال الرَّسُول کی صدائیں غنیمت ہیں، مگر کیا ہمارا دینی تقاضا بس یہی ہے کہ ہم اسی پر اکتفا کرکے بیٹھ جائیں اور اقامتِ دین کے لیے اپنے اکابرین کے طرزِ عمل کو یکسر نظرانداز کرکے تحفظِ مدارس کی فکر میں خود کو ہلکان کرتے رہیں۔ یہ کتنی بدنصیبی کی بات ہے کہ جو دارالعلوم اقامتِ دین کے لیے مورچے کا کردار ادا کرنے کے لیے قائم ہوا تھا، آج اس کے نام لیواؤں کو یہ فکر کھائے جاتی ہے کہ مدارس کا وجود مٹا دیا جائے گا۔ درحقیقت یہ مسئلہ مدارس کے وجود وعدم وجود کا نہیں، بلکہ اپنی وراثت اور امارت کی بقاء ودوام کا ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ مولانا نانوتویؒ کے قائم کردہ دارالعلوم دیوبند کی نسبت سے آج ہم دیوبندی کہلاتے ہیں، لیکن ہم میں سے اکثر یہ نہیں جانتے کہ دیوبند کسی عمارت یا رسمیت کا نام نہیں، بلکہ یہ ایک مستقل نظریہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک ایسا نظریہ جو آنحضرت ﷺ کے بتلائے ہوئے راستے پر چل کر ایک آزاد اسلامی نظام کے قیام کے لیے منظّم جدوجہد کی دعوت دیتا ہے۔ چنانچہ ہمارے اکابرین کی جدوجہدِ آزادی اور وقت کی ظالمانہ اور طاغوتی طاقتوں کے خلاف قربانیاں اس نظریے کی زندہ مثالیں ہیں۔

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے دارالعلوم دیوبند کے جو اصول وضوابط وضع کیے تھے وہ ’’اصول ہشتگانہ‘‘ کے نام سے موسوم ہیں۔ ذیل میں ہم محض پہلے اصول پر اپنی معروضات پیش کرتے ہیں۔ مولانا نانوتویؒ کے پہلے اصول کی پہلی شق کے الفاظ درج ذیل ہیں:

’’آزادیٔ ضمیر کے ساتھ ہر موقع پر کلمۃ الحق کا اعلاء ہو۔ کوئی سنہری طمع، مربیانہ دباؤ

یا سرپرستانہ مراعات اس میں حائل نہ ہو سکے۔‘‘(۸)

لیکن آج بدقسمتی سے محض چند مدارس کو چھوڑ کر ہمارے مدارس کی اکثریت مولانا کے اس اصول پر پورا نہیں اترتی۔ ہمارے مدارس میں آہستہ آہستہ آزادیٔ ضمیر کے ساتھ وقت کی جابر طاقتوں کے خلاف ’’اعلاء کلمۃ الحق‘‘ کی اہلیت ختم ہوتی جا رہی ہے۔ دارالعلوم دیوبند اس لیے قائم ہوا تھا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں مسلمانوں کو ہونے والے عظیم نقصان کا ازالہ کیا جا سکے۔ جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد مسلمانانِ ہند ہندوستان میں جس کس مپرسی کی حالت میں زندگیاں گزار رہے تھے اور عیسائی مشنریاں جس دیدہ دلیری سے شعائرِ اسلام کا مذاق اڑانے اور مسلمانوں کو عیسائی بنانے میں سرگرم تھیں‘ اس کا تقاضا تھا کہ ایک ایسا مرکز قائم کیا جائے‘ جہاں مسلمانوں کی دینی‘ سیاسی اور اخلاقی تربیت کے ساتھ ساتھ وقت کی جابر طاقت یعنی حکومتِ برطانیہ کے خلاف ایسے رجال تیار کیے جائیں جو انہیں اس شکست کا مزا چکھا دیں۔

بنابریں دارالعلوم کے قیام کا مقصد صرف درس وتدریس نہیں تھا‘ بلکہ ایک ایسا مرکز قائم کرنا مقصود تھا جہاں مسلمانوں کی بچی کھچی انفرادی صلاحیتوں کو اجتماعی شکل دے دی جائے۔ اور یہ اجتماعی طاقت اس مقصد کا احیاء کرے اور اس کام کو مکمل کرے‘ جو حضرت سیدین رحمہم اللہ کے ہاتھوں انجام نہ پا سکا تھا۔ چنانچہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی‘ مولانا رشید احمد گنگوہی اور خود مولانا نانوتوی ﷺ کی زندگیاں اور کردار اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ ان کی زندگی کا طویل حصہ انگریز حکومت کے خلاف علمی وعملی جہاد میں گزرا۔ نیز حضرت نانوتویؒ کا وضع کردہ پہلا اصول ہی ایسا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ کسی بھی سنہری طمع‘ سرپرستانہ مراعات اور مربیانہ دباؤ میں آئے بغیر آزادیٔ ضمیر کے ساتھ حق گوئی سے باز نہیں آنا۔ لہٰذا یہ اصول ہمیں یہ سوچنے کی دعوت دیتا ہے کہ ایک ایسے غلام ملک میں جہاں مذہب‘ حکومت اور آزادیٔ رائے پر کسی جابر وقت کا تسلط ہو‘ کیا یہ اصول بالواسطہ نہ سہی بلاواسطہ ایک انقلابی دعوت نہیں ہے؟

اگر ہم اپنے گردوپیش کا جائزہ لیں تو آج ملک بھر میں ہزاروں مدارس درس وتدریس میں مشغول ہیں اور ان سے فارغ التحصیل ہونے والے طلبہ کی تعداد لاکھوں میں ہوتی ہے۔ لیکن اگر ان طلبہ سے اپنے اکابرین کی جدوجہد کے بارے میں پوچھیں تو سخت مایوسی اور ناخوشگوار حیرت ہوتی ہے۔ درحقیقت ہمارے مدارس نظریہ دیوبند سے بہت دور ہو چکے ہیں اور اس کی کئی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

(۱) آج ملک بھر میں کوئی ایک مدرسہ بھی ایسا نہیں جو آزادیٔ ضمیر اور حریتِ رائے کے ساتھ

مربیانہ دباؤ اور سرپرستانہ مراعات میں آئے بغیر عصرِ حاضر کے مسائل سے نبرد آزما ہونے کے حوالے سے واضح لائحہ عمل یا پروگرام رکھتا ہو۔ اگر کوئی حق گو ’’اعلاء کلمۃ الحق‘‘ کرتا بھی ہے تو اس کی اس انفرادی صدا کو مجذوب کی بڑ سے زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔

(۲) آج ہمارے مدارس کے مسندنشینوں کی حق گوئی محض اخباری بیانات اور جذباتی تقریروں تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ ایک دوسرے پر تکفیر کے فتاوی جاری کرنے کو ’’اعلاء کلمۃ الحق‘‘ سمجھ لیا گیا ہے۔ جہاں ایک طرف دہشت گردی کا عذاب مسلط ہے وہیں فتویٰ گردی کے عمل سے بھی کوئی دامن محفوظ نہیں رہا ہے۔

(۳) ایک طرف تو تکفیری فتاویٰ کی بھرمار ہے تو دوسری طرف سرمایہ داروں کے مفادات کے تحفظ کے لیے بڑی فراخ دلی سے من پسند فتاویٰ جاری کیے جاتے ہیں۔ انہی سرمایہ داروں کے مال سے اگر مدارس چلانے ہوتے تو حضرت نانوتویؒ سمیت بہت سے اکابرین کے لیے یہ عمل ناممکن نہیں تھا۔ مضاربہ اسکینڈل جیسی دونمبریوں سے معصوم عوام کو دھوکہ دینے کے عمل میں بعض جیّد مدارس کے ’’دارالافتاء‘‘ کا بڑا نمایاں کردار رہا ہے جو سب پر آشکار ہے۔

(۴) اکابرین دیوبند کا عمل تو یہ تھا کہ تنخواہ کے حوالے سے خود کو بطور مثال پیش کرتے تھے اور مالی حوالے سے بہت احتیاط برتتے تھے۔ لیکن آج صورت حال یہ ہے کہ مدارس کے مہتممین اور ان کی اولادیں تو شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ سے زندگی بسر کرتے ہیں جبکہ غریب مدرس کی انتہائی بری حالت ہے۔ اگر مالی حوالے سے کوئی احتجاج کی آواز بلند ہوتی بھی ہے تو اسے اکابرین کے اخلاص وتقویٰ کے وعظ پر ٹرخا دیا جاتا ہے۔

(۵) آج ہمارے مدارس کی اکثریت مذہب اور سیاست کو الگ الگ رکھنے پر مصر ہیں۔ چنانچہ اس رویے نے ہمارے معاشرے میں دین ودنیا کی تفریق کے تصور کو مزید مستحکم کیا ہے‘ جس کے نتیجے میں مدارس اور سماج کے درمیان وسیع خلیج حائل ہو گئی ہے۔ عوام میں یہ تاثر قائم ہو گیا ہے کہ علماء کا کام محض نکاح ووفات کی رسوم سرانجام دینا ہے‘ دیگر سماجی مسائل کا حل ان کے پاس نہیں ہے۔

(۶) ہمارے وہ احبابِ مدارس جنہوں نے افغانستان کے حوالے سے جہاد کے فتاویٰ شائع کروا کر بلکہ اس میں خود عملاً شریک ہو کر ’’شیخ المجاہدین‘‘ اور ’’سرپرستِ مجاہدین‘‘ کے القابات پائے اور اس عمل کو ’’اعلاء کلمۃ الحق‘‘ کا عظیم فریضہ قرار دیا‘ آج پاکستان کے

معروضی حالات میں ان کی فقہی بصیرت نے انہیں خاموش کرا رکھا ہے۔

(۷) ہمارے مدارس کے وہ لوگ جو سیاست کو دین سے الگ تصور نہیں کرتے اور مذہبی سیاست کی دعوت دیتے ہیں' آج ملک کے سیکولر اور لادینی نظام کا حصہ بن چکے ہیں اور بزعم خویش اسی پر مطمئن ہیں کہ نظام کا حصہ بن کر نظام کو تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ایک طرف تو ''کچھ دو کچھ لو'' کا نعرہ لگایا جاتا ہے اور دوسری طرف اسلامی شریعت کے نفاذ کی بات کی جاتی ہے۔ اس دوعملی نے نا صرف آزادیٔ ضمیر کو متاثر کیا ہے بلکہ عوام بھی مدارس کی پروردہ مذہبی و دینی جماعتوں سے مایوس ہوتے جا رہے ہیں۔

(۸) فروعی مسائل پر بحث شروع دن سے رہی ہے لیکن آج ہمارے دینی مدارس دین کے اس ایک محاذ کو محاذِ کل سمجھے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہم معمولی اختلافات کا شکار ہو کر فرقہ در فرقہ بٹتے چلے جا رہے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ یہ فرقہ بندی مسلکِ دیوبند سے باہر کی نہیں بلکہ آج دیوبندی کہلوانے والی بیسیوں جماعتیں ہمارے اردگرد موجود ہیں۔ چنانچہ نظریۂ دیوبند انہی جماعتوں کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر رہ گیا ہے۔

بہرحال مولانا نانوتویؒ کے گزشتہ ذکر کیے گئے پہلے اصول کی دوسری شق کے الفاظ یہ ہیں:

> ''اس کا (دیوبند کا) تعلق عام مسلمانوں کے ساتھ زائد سے زائد ہو' تاکہ یہ تعلق خود بخود مسلمانوں میں ایک نظم پیدا کر دے جو ان کو اسلام اور مسلمانوں کی اصل شکل پر قائم رکھنے میں معین ہو۔ اور اس طرح اسلامی عقائد اور اسلامی تہذیب ہمیشہ کے لیے ورنہ کم از کم اس وقت تک کے لیے محفوظ ہو جائے جب تک کہ یہ مرکز اپنے صحیح اصول پر قائم رہے۔ نیز توکل علی اللہ اور عوام کی طرف سے احتیاج خود کارکنانِ مدرسہ کو اسلامی شان پر باقی رکھ سکے اور جابرانہ استبداد یا ریاست کا ٹھاٹھ ان میں قطعاً نہ پیدا ہو' بلکہ ایک جمہوری تعلق ہو جو ایک کو دوسرے کا محتاج بنائے رکھے۔ اور اس طرح آپس میں خود ایک دوسرے کی اصلاح ہوتی رہے۔''(۹)

بدقسمتی سے ہمارے موجودہ مدارس مولانا نانوتویؒ کے اس اصول پر بھی پورا نہیں اترتے۔ دیوبند کا مقصد تو یہ تھا کہ عوام الناس سے زیادہ سے زیادہ تعلق پیدا ہو اور اس کا سیاق و سباق یہ تھا کہ ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں انقلابی سوچ کی حامل ایک جماعت صفحہ ہستی سے مٹائی جا چکی تھی اور مسلمان قوم ہر جگہ انگریزوں کے شکوک و شبہات اور ظلم و ستم کا نشانہ بنی ہوئی تھی۔ ان حالات میں مسلمانوں کے علمی حلقوں میں دو سوچیں ابھر کر سامنے آئیں:

(ا) پہلی سوچ کے حامل وہ لوگ تھے جو انگریز سامراج سے قطعی مرعوب نہیں تھے بلکہ ان سے شدید نفرت کے جذبات رکھتے تھے اور اپنی مذہبی' ثقافتی اور علمی روایات کو کسی طور پر چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھے۔ اس فکر کی نمائندگی ''مدرسہ دیوبند'' کر رہا تھا۔

(ب) دوسری سوچ کے حامل وہ لوگ تھے جو انگریز سامراج سے متاثر ہو کر ہر میدان میں مدافعانہ اور غلامانہ سوچ کو پروان چڑھا رہے تھے اور اس فکر کی نمائندگی سرسید احمد خان کا قائم کردہ کالج علی گڑھ کر رہا تھا۔

ہمارے لیے یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ ''علی گڑھ'' کا ادارہ ''دارالعلوم'' کے مقابلے میں قائم کیا گیا' تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ انگریز سامراج نے اپنی حکمتِ عملی سے ان ہر دو اداروں کو ایک دوسرے کے مقابل لا کھڑا کیا اور ان کی باہمی رقابت سے سیاسی فوائد حاصل کیے۔ اس باہمی رقابت کو ولی اللّٰہی جماعت کے تیسرے دور کے امام شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے دور کیا اور اجتماعی ترقی و ملی آزادی کے لیے ایک دوسرے کو مل جل کر کام کرنے کی دعوت دی۔ تاہم اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ مولانا نانوتویؒ جدید علوم و فنون یا انگریزی زبان کے مخالف تھے۔ حضرت نانوتویؒ اور سرسید احمد خانؒ کے ایک استاد مولانا مملوک علی نانوتویؒ تھے جو کہ شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے شاگرد تھے۔ حضرت نانوتویؒ جدید علوم و فنون کے قائل تھے اور ان علوم کا حصول طلبہ کے لیے ضروری خیال فرماتے تھے۔ چنانچہ سید محبوب رضوی نے مولانا نانوتویؒ کی یہ تحریر نقل کی ہے:

> ''اگر طلبہ مدرسہ ہذا' مدارس سرکاری میں جا کر علومِ جدید حاصل کریں تو ان کے کمال میں یہ بات زیادہ مؤید ہوگی۔''(۱۰)

مولانا احمد عبدالمجیب قاسمی حضرت نانوتویؒ کے تصورِ علومِ جدیدہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''جدید تعلیم کے حصول سے حضرت نانوتویؒ نے منع نہیں فرمایا اور کیسے منع کرتے وہ تو باخبر' زمانہ شناس اور صاحبِ بصیرت عالم تھے اور تقاضائے زمانہ سے آگاہ تھے' بلکہ ایک گونہ ترغیب بھی دلائی۔''(۱۱)

تاہم ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ مولانا نانوتویؒ نے عصری اور دینی تعلیم کے مشترکہ نصاب کو دارالعلوم میں کیوں جاری نہیں فرمایا؟ تو اس کا جواب مولانا نے خود یہ دیا ہے کہ:

> ''زمانۂ واحد میں علومِ کثیرہ کی تحصیل' سب علوم کے حق میں باعثِ نقصانِ استعداد رہتی ہے۔''(۱۲)

مولانا کے اس جملہ سے واضح ہوجاتا ہے کہ وہ بیک وقت دینی وعصری تعلیم کی تدریس کو استعداد پیدا نہ ہونے کا باعث قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ ان کا مقصد یہ تھا کہ دینی تعلیم کے حاملین فراغت کے بعد عصری تعلیمی اداروں میں آئیں اور عصری تعلیم کے حاملین مدارسِ دینیہ میں آئیں۔ اگر وہ جدید علوم وفنون کے حوالے سے عصری تعلیمی اداروں کے مخالف ہوتے تو خود مولانا مملوک علیؒ سے کیوں پڑھتے جو شاہ عبدالعزیزؒ کے فتویٰ کی روشنی میں انگریز کے قائم کردہ کالج میں نوجوانوں کی تربیت کا محاذ سنبھالے ہوئے تھے۔ بلکہ مولانا گیلانیؒ کے مطابق تو مولانا نانوتویؒ خود انگریزی زبان سیکھنے کے خواہش مند تھے اور دارالعلوم دیوبند میں سنسکرت زبان سیکھنے کا اہتمام بھی تھا۔ (۱۳)

ان دونوں مکاتب فکر کا مقصد آزادی تھا' لیکن حصولِ مقصد کے طریقے میں اختلاف تھا اور یہ اختلاف وقت کے ساتھ ساتھ اس قدر طویل ہوا کہ انگریزوں کے خلاف دو الگ محاذِ جنگ قائم کرنے کی بجائے مسلمان خود آپس میں محاذ آراء ہوگئے اور یہ فکری محاذ آرائی اب تک قائم ہے۔ حالانکہ ان دونوں فکری تحریکوں کا ملاپ سماجی تبدیلی کا صحیح راستہ متعین کرنے میں معاون ومددگار ہوسکتا تھا۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے اس کمی کو شدت سے نا صرف محسوس کیا بلکہ ان دونوں تحریکات کے اشتراک کے نتیجے میں ایک قومی انقلاب برپا کرنے کے لیے کئی عملی اقدامات اٹھائے۔ مولانا اپنی مستقبل بینی اور عبقریت کی بنا پر بھانپ گئے تھے کہ غلبہ دین کو جدید دور کے کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے اور اس کی بنیاد پر حریت وآزادی کی جدوجہد کو کامیاب بنانے کے لیے' دارالعلوم (دینی) اور علی گڑھ (عصری) کے اداروں کو مل کر کام کرنا ہوگا۔ انہوں نے اپنی اس سوچ کا اظہار اپنی آخری تقریر میں کیا جو انہوں نے جامعہ ملیہ کے تاسیسی جلسے میں کی تھی۔ انہوں نے فرمایا:

''اے نونہالانِ وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غم خوار (جس میں میری ہڈیاں پگھلی جارہی ہیں) مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور سکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا۔ اور جس طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں (دیوبند اور علی گڑھ) کا رشتہ جوڑا' کچھ بعید نہیں کہ بہت سے نیک نیت بزرگ میرے اس سفر پر نکتہ چینی کریں اور مجھ کو مرحوم بزرگوں کے مسلک سے منحرف بتلائیں۔ لیکن اہلِ نظر سمجھتے ہیں

کہ جس قدر میں بظاہر علی گڑھ کی طرف آیا ہوں' اس سے کہیں زیادہ علی گڑھ میری طرف آیا ہے۔'' (۱۴)

حضرت شیخ الہندؒ نے مزید فرمایا:

''آپ میں سے جو حضرات محقق اور باخبر ہیں' وہ جانتے ہوں گے کہ میرے اکابر سلف نے کسی وقت بھی کسی اجنبی زبان کے سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم وفنون حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا۔ ہاں! یہ بیشک کہا گیا کہ اگر انگریزی تعلیم کا آخری اثر یہی ہے جو عموماً دیکھا گیا ہے کہ لوگ نصرانیت کے رنگ میں رنگے جائیں یا ملحدانہ گستاخیوں سے اپنے مذہب اور مذہب والوں کا مذاق اڑائیں..... تو ایسی تعلیم پانے سے ایک مسلمان کا جاہل رہنا ہی اچھا ہے۔ ازراہِ نوازش آپ ہی انصاف کیجئے کہ یہ تعلیم سے روکنا تھا یا اس کے اثرِ بد سے؟'' (۱۵)

حضرت شیخ الہندؒ نے ہی علی گڑھ کے فاضل اور شہرۂ آفاق مقرر مولانا محمد علی جوہر مرحوم کو دیوبند آنے کی دعوت دی اور باوجود اس کے کہ وہ کوئی عالمِ دین یا فقیہہ نہیں تھے اپنی دستار ان کے سر پر رکھ دی۔ حضرت شیخ الہندؒ کے اس عمل سے دو نتائج برآمد ہوئے:

(ا) اوّل مولانا کی وسیع القلبی اور اخلاق ومحبت کے اس عظیم مظاہرہ سے بہت سے علیگ یا غیر درسی حضرات تحریک دیوبند کے حوالے سے اپنے نکتہ نظر پر نظر ثانی کے لیے آمادہ نظر آنے لگے۔ چنانچہ حضرت شیخ الہندؒ کا وسیع حلقہ ایسے حضرات کا تھا جو مذہبی معاملات میں محض نمود ونمائش کا قائل نہیں تھا۔ نیز حضرت کی انہی پالیسیوں کی بدولت (جو کہ دراصل حضرت نانوتویؒ ہی کے پہلے اصول کی دوسری شق کا احیاء تھا) ماسوائے انگریز حکومت اور اس کے گماشتوں کے کوئی دوسرا دشمن نہ تھا۔

(ب) دوسرا نتیجہ مولانا کے اس عمل کا یہ ہوا کہ اربابِ دیوبند کا ایک مخصوص ذی اقتدار طبقہ ان کا مخالف ہوگیا اور ان کی راہ میں مزاحم ہوگیا۔ چونکہ مولانا کی ذاتی علمی وجاہت اور مقام ومرتبہ کی وجہ سے کسی کو یہ جرأت تو نہ ہوئی کہ وہ علی الاعلان ان کی مخالفت کرتا' لیکن شیخ الہندؒ کی پالیسیوں کو ناکام بنانے اور ان کی طاقت ختم کرنے کے لیے ان کے قریبی ساتھیوں کو ان سے الگ کرکے اور دارالعلوم بدر کرکے حضرت کی طاقت اور زورِ بازو کو کمزور کردیا گیا۔ اس حلقہ نے ایسا کیوں کیا؟ اس کا لازمی جواب یہی ہے کہ یہ حلقہ دارالعلوم کی عمارت اور طریقہ تعلیم کو ان ''تخریبی عوامل'' سے بچانا چاہتا تھا جو حضرت شیخ

الہندؒ کی پالیسیوں کے نتیجے میں مدرسہ کو لاحق تھے۔

وہ لوگ جو حجرہ نشینی کے قائل تھے اور اقامتِ دین کے حوالے سے عملی جدوجہد سے فرار اختیار کرتے ہوئے دارالعلوم کو محض درس وتدریس تک محدود رکھنا چاہتے تھے‘ ان کے بارے میں حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا:

> ’’اسلام صرف عبادات کا نام نہیں‘ بلکہ وہ تمام مذہبی‘ تمدنی‘ اخلاقی‘ سیاسی ضرورتوں کے متعلق ایک کامل ومکمل نظام رکھتا ہے۔ جو لوگ کہ زمانہ موجودہ کی کشمکش میں حصہ لینے سے کنارہ کشی کرتے ہیں اور صرف حجروں میں بیٹھ رہنے کو اسلامی فرائض کی ادائیگی کے لیے کافی سمجھتے ہیں‘ وہ اسلام کے پاک وصاف دامن پر ایک بدنما دھبہ لگاتے ہیں۔ ان کے فرائض صرف نماز‘ روزہ میں منحصر نہیں‘ بلکہ اس کے ساتھ ہی اسلام کی عزت برقرار رکھنے اور اسلامی شوکت کی حفاظت کی ذمہ داری بھی ان پر عائد ہوتی ہے۔‘‘(۱۶)

بہرحال آج اکثر مدارس حضرت نانوتویؒ کے پہلے اصول کی دوسری شق پر بھی پورا نہیں اترتے۔ حضرت نانوتویؒ کا فرمانا تو یہ تھا کہ عام مسلمانوں سے زیادہ تعلق ہو لیکن آج ہمارے اربابِ مدارس عام مسلمانوں سے اتنے ہی دور ہیں۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ دوریاں ختم ہوتیں مگر یہ جوں کی توں قائم ہیں بلکہ ان میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔

چنانچہ حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے استاد کی وضع کردہ اس شق کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مساعی کیں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب کیا تاکہ وہ اس اجتماعی نظام کا حصہ بن سکیں اور خود کو الگ جنس تصور نہ کریں۔ لیکن بدقسمتی سے ان کی مساعی سے انحراف ان کی موت کے کچھ ہی عرصے بعد شروع ہوگیا تھا۔ ’’مولوی‘‘ اور ’’بابو‘‘ کی اصطلاحات نے اسے مزید ہوا دی اور آج یہ حال ہے کہ ہمارے اربابِ مدارس کالج اور یونیورسٹی کے نیم مذہبی طلبہ کو بنظرِ حقارت دیکھتے ہیں۔ نیز اسلام اور عصری تقاضوں سے متعلقہ ان کے شکوک وشبہات کا ازالہ کرنے کی بجائے اپنے اخلاقی‘ سماجی اور معاشرتی رویوں سے انہیں خود سے مزید دور کرتے جارہے ہیں‘ جس کا لازمی نتیجہ یہی برآمد ہوا ہے کہ آج ہمارے کالج اور یونیورسٹیوں کے قابلِ قدر اور مستقبل کے سیاسی ومعاشرتی معمار اپنی لگامیں لادینی قوتوں کے سپرد کرچکے ہیں۔ اور یہ سب حضرت نانوتویؒ کے اصول سے انحراف کا نتیجہ ہے۔

حضرت نانوتویؒ کے اس زریں اصول میں یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ اللہ پر توکل اور عوام کی طرف سے احتیاج کی وجہ سے مدرسہ کے کارکنوں میں جابرانہ استبداد اور ریاست کا ٹھاٹھ

پیدا نہ ہوگا۔ کراچی کے بعض بڑے مدارس کے وارثین اور مفتیان سے ملنے کا اتفاق ہوا تو احساس ہوا کہ شاید گورنر سے ملنا اتنا مشکل نہ ہوتا جتنا ان حضرات سے ملنے میں دقتیں پیش آئیں۔ علماءِ حق اور صوفیاء کا شیوہ تو یہ تھا کہ وہ اُمراء سے کتراتے اور غرباء کے پاس خود چل کر جاتے تھے۔ اسی وجہ سے ایک بوسیدہ جھونپڑی میں بیٹھے حق گو عالم وصوفی کی حق گوئی سے قصرِ خلافت کانپتا تھا۔ لیکن آج کی صورتحال اس کے برعکس ہے۔

حضرت نانوتویؒ کا یہ فرمانا بھی قابلِ توجہ ہے کہ اس طرح کا ٹھاٹھ اور جابرانہ تعلق پیدا نہ ہو‘ بلکہ ایک جمہوری تعلق ہو جو فریقین کو ایک دوسرے کا محتاج بنا کر رکھے اور اس طرح خود ایک دوسرے کی اصلاح ہوتی رہے۔ لیکن آج یہ احتیاج اور اصلاح یک طرفہ ہوکر رہ گئی ہیں۔ یعنی مدارس عوام کی مالی امداد کے محتاج ہیں لیکن عوام ان کی طرف سے اپنی اصلاح کے نہ محتاج ہیں اور نہ اس پر آمادہ نظر آتے ہیں‘ اور اس ساری خرابی کی اصل یہ ہے کہ آج ہمارے مدارس اس زعم میں بری طرح مبتلا ہیں کہ اصلاح کرنا صرف انہی کا حق ہے۔ عوام کو یہ حق حاصل نہیں کہ اگر وہ ان میں کوئی خامی دیکھیں تو ان کی اصلاح کردیں۔ چنانچہ اس عمل نے مذہبی اجارہ داری کی فکر کو ہوا دی ہے‘ اور اس کا لازمی نتیجہ یہی برآمد ہوا ہے کہ آج ہمارے علماءِ مدارس کے اصلاحی احکامات مدارس تک ہی محدود ہوکر رہ گئے ہیں اور عوام پر اس کے خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہورہے۔

غرض اربابِ مدارس کو آج اس بات پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ آج کے مدارس اس نظریاتی دارالعلوم دیوبند سے کس قدر دور ہیں جس کی نیو حضرت نانوتویؒ نے اٹھائی تھی۔ اگر دارالعلوم کسی نظریاتی جدوجہد کا نام ہے تو آج ہمارے مدارس بانجھ کیوں ہوگئے ہیں؟ ہمیں سوچنا چاہئے کہ آج ہندوستان کی سب سے بڑی تحریک آزادی (دارالعلوم دیوبند) کے نام لیوا اسلامی نظام کے قیام میں اپنا کیا کردار ادا کررہے ہیں؟ آج کتنے مدارس ایسے ہیں جو حضرت نانوتویؒ کے اس پہلے اصول پر عمل پیرا ہیں؟ یہ بات بھی سوچنے کے قابل ہے کہ اربابِ مدارس دیوبند کی تاریخ‘ اس کے مقاصد اور ان مقاصد کے حصول کے لیے علماءِ دیوبند کی شاندار اور بے مثال قربانیوں کو اپنے نصابِ تعلیم کا حصہ کیوں نہیں بناتے؟ آخر کیا وجہ ہے کہ منطق وفلسفہ کی فرسودہ کتابیں اور اراکین وفاق المدارس کی کتب تو نصاب کا حصہ بن سکتی ہیں مگر شاہ ولی اللہ (الفوز الکبیر کے علاوہ)‘ شاہ عبدالعزیز‘ مولانا نانوتوی‘ مولانا گنگوہی‘ شیخ الہند‘ مولانا مدنی اور سید محمد میاں رحمہم اللہ جیسے اکابر علماءِ دیوبند کی کتب کیوں نہیں پڑھائی جاتیں؟ حقیقت تو یہ ہے کہ آج ہمارے مدارس کے فاضلین اپنے اکابرین کے حقیقی تعارف

سے محروم ہو چکے ہیں' اور یہ ایک المیہ ہے جس کی ذمہ داری اربابِ مدارس اور اس سے بھی بڑھ کر وفاق المدارس پر عائد ہوتی ہے۔ اگر آج ہم اس نظریاتی دیوبند کے اصول وضوابط وحصولِ مقاصد پر عمل پیرا ہیں تو اس کی عملی توجیہہ ہو' بصورت دیگر ہمارے ان بانجھ اداروں کو اپنا تعلق اس عظیم نظریاتی دارالعلوم کے ساتھ جوڑنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔

حواشی

(۱) محبوب رضوی' تاریخ دارالعلوم دیوبند' ج ۱' ص ۱۶۹' المیزان' لاہور ۲۰۰۵ء۔
(۲) گیلانی' مناظر احسن' سوانح قاسمی' ج ۲' ص ۲۲۳' مکتبہ رحمانیہ' لاہور۔
(۳) ماہنامہ الولی حیدرآباد' ج ۱۴' شمارہ ۱۱' ص ۲۷' ۱۹۹۱ء۔
(۴) گیلانی' مناظر احسن' احاطہ دارالعلوم میں بیتے ہوئے ایام' ص ۱۷۰' ادارہ تالیفات اشرفیہ' ملتان' ۱۹۹۷ء۔
(۵) ایضاً' ص ۱۷۱۔
(۶) گیلانی' مناظر احسن' سوانح قاسمی' ج ۲' ص ۲۲۲ و ۲۲۳۔
(۷) ایضاً' ص ۲۲۳ء۔
(۸) سید محمد میاں' علماء ہند کا شاندار ماضی' ج ۵' ص ۴۸' مکتبہ رشیدیہ' کراچی' ۱۹۹۲ء۔
(۹) ایضاً۔
(۱۰) محبوب رضوی' تاریخ دارالعلوم دیوبند' ج ۲' ص ۳۰۲۔
(۱۱) حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم نانوتوی: حیات' افکار' خدمات (مجموعہ مقالات)' ص ۲۸۰' تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند' نئی دہلی' ۲۰۰۵ء۔
(۱۲) ایضاً' ص ۲۸۱۔
(۱۳) گیلانی' مناظر احسن' برصغیر پاک وہند میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت' ج ۲' ص ۴۰۔
(۱۴) مدنی' حسین احمد' مولانا' نقشِ حیات' ج ۲' ص ۶۷۷' دارالاشاعت' کراچی۔
(۱۵) ایضاً۔
(۱۶) ابوسلمان شاہجہان پوری' شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ: ایک سیاسی مطالعہ' ص ۲۱۱' مجلس یادگار شیخ الاسلام' کراچی' ۱۹۸۸ء۔

حاجی عبدالواحد صاحبؒ کی یادداشتیں (۵)

مرتّب: پروفیسر حافظ قاسم رضوان

☆

خواجہ عبدالحئی فاروقیؒ اور اباجی

۱۹۱۷ء میں گورنمنٹ ہائی سکول‘ کوئٹہ سے میٹرک کرنے کے بعد اباجی نے لاہور آ کر اسلامیہ کالج‘ ریلوے روڈ میں داخلہ لیا اور ہوسٹل میں مقیم ہوئے۔ نیک گھرانے سے تعلق اور صالح والد کے اثر کی بنا پر کسی مردِ خدا کی صحبت کی جستجو بھی تھی۔ انہی دنوں خواجہ عبدالحئی فاروقی ایک نزدیکی چوبارے (بالاخانے) پر درسِ قرآن دیتے تھے۔ پتا چلنے پر اباجی بھی فوراً درس اور خواجہ صاحب کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔ گویا اباجی کی اکابرین میں سے پہلی شناسائی خواجہ صاحب سے ہی ہوئی۔ خواجہ عبدالحئی‘ مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔ ان کی شخصیت اور مخصوص طرزِ درس نے اباجی کی ذہن سازی اور سانچہ زندگی میں ایک خاص کردار ادا کیا۔ اباجی اکثر بتایا کرتے تھے کہ خواجہ صاحب کے درسِ قرآن کے حوالے سے اس ایک آیت نے تو ان کی سوچ اور فکر کو بالکل پلٹ کر رکھ دیا اور وہ بالکل ایک نئے راستے کے مسافر بن کر رہ گئے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِیْعُوْا فَرِیْقًا مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ یَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِیْمَانِكُمْ كٰفِرِیْنَ﴾ (آل عمران)

’’اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر تم ان اہلِ کتاب کے کسی گروہ کی بات مان لو گے تو یہ تم کو تمہارے ایمان کے بعد پھر کفر کی حالت میں لوٹا کر لے جائیں گے۔‘‘

خواجہ عبدالحئی فاروقی کے درس و تدریس کا مرکزی موضوع رجوع الی القرآن تھا اور ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی ساری دعوت کا مرکزی نکتہ بھی یہی تھا۔ اسی وجہ سے اباجی اکثر و بیشتر ڈاکٹر

صاحب سے کہا کرتے تھے کہ خواجہ عبدالحئی اپنے زمانے کے ڈاکٹر اسرار احمد تھے‘ اور آپ اپنے زمانے کے خواجہ عبدالحئی فاروقی ہیں۔ خواجہ صاحب کی سورۃ البقرۃ کی انقلابی رنگ میں تفسیر ’’اَلْخِلَافَةُ الْكُبْرٰی‘‘ کا مقدمہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے میثاق (۱۹۷۸ء) میں شائع کیا تھا۔ اس کی تقدیم میں یہ الفاظ بھی شامل تھے: ’’یہ خالص وہی فکر ہے جسے خود راقم اپنی حقیر صلاحیت اور محدود استعداد کے مطابق پھیلانے کی کوشش کر رہا ہے۔‘‘

خواجہ صاحبؒ کی مختصر سوانح حیات درج ذیل ہے:

خواجہ عبدالحئی فاروقی ۱۸۸۷ء مطابق ۱۳۰۵ھ میں پنجاب کے ضلع گورداس پور کی تحصیل گڑھ شنکر میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام خواجہ عبدالرحیم تھا۔ میٹرک گورنمنٹ ہائی اسکول‘ گورداس پور سے کیا۔ اس کے بعد دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور نصاب کی تکمیل کے بعد لگ بھگ ۱۹۱۲ء میں فارغ التحصیل ہوئے۔ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور مولانا عبیداللہ سندھیؒ سے خصوصاً متاثر ہوئے۔ مولانا انور شاہ کاشمیریؒ سے بھی شرفِ تلمذ رہا۔ مولانا سندھی سے خواجہ عبدالحئی نے بطور خاص قرآن پاک اور حجۃ اللہ البالغہ از شاہ ولی اللہؒ کا انقلابی درس لیا اور ان کے طرزِ تعلیم و اسلوب سے بے حد متاثر ہوئے۔ دیوبند سے فراغت کے بعد آپ اسلامیہ کالج‘ میرٹھ میں استاد عربی مقرر ہو گئے۔ شیخ الہند کے حکم سے ۱۹۱۳ء میں مولانا سندھی نے ’نظارۃ المعارف القرآنیہ‘ قائم کیا۔ دیگر طلبہ کے ساتھ خواجہ صاحب نے بھی یہاں سے استفادہ شروع کر دیا۔ اپنے معمول کے مطابق وہ ہفتے کی شام کو میرٹھ سے دہلی آ جاتے۔ اتوار کا سارا دن مولانا سندھی کے درس میں شامل رہتے اور پیر کی صبح میرٹھ واپسی ہوتی۔ یوں ۱۹۱۵ء تک یہ سلسلہ چلتا رہا اور پھر مولانا سندھی افغانستان ہجرت کر گئے۔ دیگر علمائے کرام کے مقابلے میں مولانا سندھی کے درسِ قرآن کا منہج ایک مختلف نوعیت کا تھا۔ آپ کا اصل مقصد طلبہ میں جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ پیدا کرنا اور انہیں آزادی حاصل کرنے کے لیے ایک متعین راہ پر لگانا تھا۔ یہی طریقہ کار مولانا احمد علیؒ اور خواجہ عبدالحئی فاروقیؒ کے دروسِ قرآن کا تھا۔ مولانا سندھی سے تعلق کے حوالے سے خواجہ عبدالحئی کے مراسم سرحد پار جماعت مجاہدین سے بھی رہے۔ مولانا سندھی کی مجوزہ ’جنودِ ربانیہ‘ میں ان کا عہدہ کرنل کے برابر کا تھا۔

۱۹۱۵ء میں مولانا محی الدین احمد قصوری نے کلکتہ سے مولانا ابوالکلام آزاد کے ارشاد کے مطابق اخبار ’اقدام‘ جاری کیا‘ تو ایک قریبی معاون کے طور پر اپنے مخلص دوست خواجہ عبدالحئی

فاروقی کو بھی کلکتہ بلا لیا۔ اس دوران مولانا آزاد نے 'حزب اللہ' کے نام سے ایک جماعت قائم کی تو یہ دونوں رفیق اس میں شامل ہو گئے۔ اس طرح کلکتہ میں 'دارالارشاد' کے نام سے مولانا آزاد نے جولائی ۱۹۱۵ء میں ایک مدرسہ بنایا' جس کا مقصد تعلیم یافتہ نوجوانوں کو قرآن مجید کی تعلیم دینے کے بعد دعوت و تبلیغ کے لیے تیار کرنا تھا۔ خواجہ عبدالحئ بھی طلبہ کے اس گروہ میں شامل تھے۔ اوائل ۱۹۱۶ء میں مولانا آزاد کو جب حکومت بنگال نے صوبہ بدر کیا تو انہیں کلکتہ کی سکونت چھوڑنی پڑی۔ یوں یہ سلسلے ختم ہو کر رہ گئے۔ ساتھ ہی 'اقدام' کی بندش کا حکم بھی جاری ہوا اور دونوں بزرگ بھی واپس لاہور آ گئے۔ اواخر ۱۹۱۶ء میں مولانا محی الدین قصوری کی نظر بندی کے ساتھ خواجہ عبدالحئ فاروقی کو بھی حکومت نے لاہور میں نظر بند کر دیا۔ سرحد پار مجاہدین کی اعانت اور حکومت کے مخالفین سے تعاون و ہمدردی' ان دونوں کا جرم تھا۔

ایامِ نظر بندی میں خواجہ عبدالحئ نے اکبری دروازہ سے باہر ایک دو منزلہ مکان کرایہ پر لے کر اپنے مخصوص اسلوب سے درسِ قرآن شروع کر دیا' جس میں اسلامیہ کالج' دیگر تعلیمی اداروں اور یونیورسٹی کے طلبہ شریک ہو کر فیض حاصل کرتے۔ ۱۹۱۹ء میں رولٹ ایکٹ کے خلاف پورے ملک میں بے چینی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ 'سانحہ جلیانوالہ باغ' کی بنا پر بالخصوص پنجاب میں 'تحریک عدم تعاون' اپنے پورے عروج پر تھی۔ یہاں تک کہ لاہور اور بعض دوسرے اضلاع میں مارشل لاء بھی نافذ ہو گیا۔ خواجہ عبدالحئ نے لاہور کی بادشاہی مسجد میں ایک بڑے اجتماع کے سامنے پرجوش تقریر کی۔ حکومت نے دیگر رہنماؤں اور کارکنوں کے ہمراہ گرفتار کر کے فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا جس کے نتیجے میں ضبطی جائیداد اور عمر قید کی سزا سنائی گئی۔ کچھ دن لاہور اور تقریباً دو سال ملتان جیل میں رہے۔ بعد میں جب حکومت کی طرف سے عام معافی اور رہائی کا اعلان ہوا تو آپ بھی ۱۹۲۱ء میں رہا کر دیے گئے۔

۲۹/اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ میں شیخ الہند کے ہاتھوں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آ چکا تھا۔ شیخ الجامعہ مولانا محمد علی جوہر تھے۔ رہائی کے بعد خواجہ عبدالحئ نے علی گڑھ جا کر ان سے ملاقات کی تو انہوں نے آپ کو تفسیر قرآن کا استاد مقرر کر دیا۔ ۱۹۲۵ء میں جامعہ ملیہ کو دہلی منتقل کر دیا گیا تو آپ بھی وہیں چلے گئے۔ مولانا سندھیؒ کے جامعہ میں قیام کے دوران آپ نے ان کے افادات کو بھی مرتب کیا۔ بالآخر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ہی آپ شیخ التفسیر کے عہدے پر فائز ہوئے اور علم و عرفان کے موتی لٹاتے رہے۔ خواجہ عبدالحئ فاروقیؒ ۱۹۵۰ء میں دہلی سے

لاہور منتقل ہو گئے۔ آپ کو ۱۹۵۲ء میں اسلامیہ کالج' ریلوے روڈ میں اسلامیات کا پروفیسر مقرر کر دیا گیا۔ دینی اور علمی لحاظ سے آپ کی شخصیت بڑی بلند تھی اور اپنے دور کے اربابِ علم و فضل سے آپ کا میل جول تھا۔ ادارہ اصلاح و تبلیغ کی بنیاد کچھ دردمند مسلمانوں نے ۱۹۳۹ء میں رکھی۔ اس کا دفتر عقب آسٹریلیا مسجد' نزد ریلوے اسٹیشن لاہور قائم تھا۔ اس کے زیر اہتمام 'آسان درسِ قرآن' مرتب کرنے کے لیے ایک علمی بورڈ کا قیام عمل میں آیا جس نے خواجہ عبدالحئ فاروقی کی زیر سرکردگی تقریباً دس سال (۱۹۵۵ء تا ۱۹۶۵ء) میں تفسیر 'درس قرآن' کی تکمیل کی اور اسے شائع کیا۔ ۷ جنوری ۱۹۶۵ء کو آپ پر فالج کا حملہ ہوا۔ ۸ جنوری ۱۹۶۵ء مطابق ۴ رمضان المبارک ۱۳۸۴ھ کو خواجہ عبدالحئ فاروقی نے اس جہان فانی کو الوداع کہا اور راہی ملک عدم ہوئے۔ نماز جنازہ کے بعد قبرستان میانی صاحب میں مولانا احمد علی لاہوری کی قبر مبارک کے نزدیک مدفون ہوئے۔ اباجی نے بھی آپ کی نماز جنازہ میں شرکت کی اور تدفین میں شامل ہوئے۔ ع ''حق مغفرت کرے' عجب آزاد مرد تھا!''

آپ کی تصانیف میں سورۃ الفاتحہ اور دیگر مختلف قرآنی سورتوں کی تفسیر' الخلافۃ الکبریٰ' صراطِ مستقیم' سبیل الارشاد' ارکانِ اسلام' ہمارے نبی ﷺ اور بصائر وغیرہ شامل ہیں۔ اس دور کے مختلف علمی رسائل و جرائد میں بھی آپ کے عالمانہ مضامین شائع ہوتے رہے۔

اباجی کے دستیاب روزنامچوں میں اپریل ۱۹۵۳ء میں خواجہ عبدالحئ فاروقی کا ذکر ملتا ہے۔ اباجی نے انجمن رضوان کے ارکان کے معاہدے کا مضمون دکھلایا۔ خواجہ صاحب نے اس پر غور کر کے اپنی رائے دینے کا وعدہ کیا۔ مئی ۱۹۵۳ء میں اباجی نے خواجہ صاحب سے پھر کسی معاملے پر ملاقات کی اور تبادلہ خیال ہوا۔ ۱۹/اکتوبر ۱۹۵۳ء کو ادارہ اصلاح و تبلیغ کا اجلاس دفتر ادارہ (آسٹریلیا بلڈنگ) میں ہوا۔ سب دوستوں نے اس نکتے پر غور کیا کہ ادارہ میں نئی جان ڈالنے کے لیے کیا اقدامات اٹھائے جائیں اور اس ضمن میں ہم سے کیا فروگزاشت ہو رہی ہے کہ ہم اپنا اصل مقصد نہیں حاصل کر پا رہے۔ بقول اباجی ''کام کا اصل مقصد اور طریق کار واضح کرنے کے لیے مختلف جوابات دیے گئے: ہم بہتر وسیع میدان میں کام کرنا چاہتے ہیں' ذرا مختصر میدان ہو جس میں توجہ پوری طرح مرکوز ہو سکے' خدمت سے مانوس کریں۔ پھر اس بنا پر اثر بھی ہوگا اور جنہیں مدد ملے گی وہ خود ہی ساتھ لگ جائیں گے۔ معاملات درست ہوں تو

لوگ خوش اور مانوس ہوں اور ساتھ ملیں اور معاملات درست ہوتے ہیں عبادات کی صحیح ادائیگی سے اور عبادات کی جانب توجہ ہوتی ہے نیکوں کی صحبت اور ان کی باتوں کے سننے سے۔ یہ بات گشت میں نصیب ہے‘ اس لیے تبلیغی تحریک میں دلچسپی لینا چاہیے۔ ذاتی کردار کی اصلاح اور بلندی کے بغیر ہدایت ممکن نہیں‘ نہ عمل درست ہوگا‘ اس لیے گفتگو میں احتیاط‘ ذمہ داری کا احساس‘ وعدہ کا ایفاء‘ امانت کی ادائیگی ضروری ہیں۔ انسان حیوان ناطق ہے اور اسی نطق کی حفاظت سے انسان بنتا ہے۔ فحش گوئی‘ یاوہ گوئی‘ دروغ گوئی‘ بسیار گوئی سے پرہیز ہو‘ تو انسان کی اصلاح ہو‘ تب ہی وہ تبلیغ کے قابل بھی بنے۔ اوّل خود پھر دوسرے کو فائدہ پہنچے‘‘۔ عشاء کے بعد میٹنگ ختم ہوگئی۔

درس قرآن بورڈ کی مسلسل اور طویل نشستوں میں سے کچھ کا ذکر درج ذیل ہے:

۳۰/اکتوبر کو ’’بعد نماز مغرب دفتر میں ادارہ کی میٹنگ ہوئی اور ادارہ کی ساری کارروائیوں اور خدمات پر نظر دوڑائی گئی۔ اراکین تبلیغ میں بھی وقت دیں اور چندہ بھی ادا کریں اور پمفلٹ بھی شائع کیے جائیں۔ قرآن مجید کی تفسیر اسباق کے طور پر یا ہفت روزہ رسالہ کی شکل میں شائع کی جائے جس کے لیے ایک سب کمیٹی قائم کی گئی جس میں حافظ نذر محمد (پرنسپل شبلی کالج‘ چوک گڑھی شاہو) اور مولوی بشیر احمد کے ہمراہ بندہ کو مقرر کیا گیا۔ اور ادارہ کے باہر سے خواجہ عبدالحئی (فاروقی) اور مولانا مرغوب احمد توفیق (سابق استاد اسلامیات وعربی‘ ڈھاکہ یونیورسٹی) لیے گئے۔ یہ سب کمیٹی اپنے فیصلہ جات کی رپورٹ کرے گی اور اسے جامہ عمل پہنانے کے لیے ادارہ کوشش کرے گا۔ ان شاءاللہ!‘‘

۸/نومبر کو اباجی مولانا مرغوب احمد توفیق سے ملے اور ان سے قرآن مجید کی تفسیر سبقاً سبقاً شائع کرنے کی تجویز پر تبادلہ خیال کیا۔ ۹/نومبر کو آسٹریلین بلڈنگ میں درسِ قرآن سبجیکٹ کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ ادارہ اصلاح وتبلیغ کی جانب سے قرآن پاک کی سبق وار تفسیر شائع کرنے اور اس کے لیے ایک ہفتہ وار رسالہ ’درسِ قرآن‘ کے نام سے جاری کرنے کا فیصلہ ہوا۔ رسالہ کے حجم‘ کاغذ‘ قیمت اور نظر ثانی کے بارے میں تمام امور پر غور کیا گیا۔ ۲۰/نومبر کو ادارہ میں پھر سبجیکٹ کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ ’’مرغوب صاحب نے فرمایا کہ درس تو کئی جگہ ہوتے ہیں اور تفسیریں بھی کئی شائع ہوچکی ہیں‘ مگر ان کا خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلتا۔ اس لیے پہلے وہ مقصد واضح ہونا چاہیے جس کے لیے درسِ قرآن قائم (شروع) کرنا چاہتے ہیں۔ یہی کہ ہر مسلمان قرآن

مجید کو سمجھ کر اپنی ساری زندگی قرآن مجید اور اسلام کے مطابق گزار سکے اور فرد اور سوسائٹی کا ربط بھی اسلام ہی کے مطابق ہو۔ سوسائٹی فرد کی ضروریات پوری کرے اور فرد سوسائٹی کی اطاعت کرے‘‘۔ سب نے اسے تسلیم کیا تو مرغوب صاحب نے فرمایا: ’’اسی مقصد کے تحت زندگی کے سب پہلوؤں پر ہدایات جمع کی جائیں اور قرآن مجید میں جہاں جہاں یہ ہدایات وارد ہوں‘ انہیں یکجا کر کے ایک موضوع کو مکمل کر دیا جائے تاکہ ہر ایک اسے سمجھ سکے اور اس پر عمل پیرا ہو کر فلاحِ دارین حاصل کر سکے۔ آمین!‘‘ چنانچہ سب حاضرین نے مرغوب صاحب سے کہا کہ آپ یہ چیز لکھ کر دکھلائیں اور انہوں نے اگلے جمعہ کو دکھلانے کا وعدہ کیا۔

اگلے جمعہ ۱۱/دسمبر کو حسب وعدہ مرغوب صاحب بعد از نماز عصر ادارہ کی میٹنگ میں اپنے مضمون سمیت تشریف لائے۔ ’’اسلامی معاشرہ قائم کرنے کے لیے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کیسے مرتب ہو؟ مضمون تو بہترین اور بلند ترین ہے مگر زبان بھی مشکل ترین اور غیر معروف ترین میں لکھا گیا ہے۔ مرغوب صاحب یا کوئی اور اسے عام فہم اردو میں ادا کرے (تحریر کرے) تو چھپ سکتا ہے۔ مرغوب صاحب نے یہی کہا کہ ان کا مضمون عمل کے لیے ہے‘ چھاپنے کے لیے نہیں‘‘۔ بعد ازاں فیصلہ ہوا کہ فی الحال رسالہ ’درس قرآن‘ ہی جاری کیا جانا بہتر ہے اور اس کا لکھنا اور چلانا خواجہ عبدالحئی فاروقی کے ہی حوالے کیا جائے۔ دسمبر میں ہی خواجہ صاحب کے لیے آسٹریلین بلڈنگ میں ایک مکان کا بھی انتظام کر دیا گیا۔ فروری ۱۹۵۴ء کے آخر میں خواجہ صاحب متعلقہ مکان میں رہائش پذیر ہوگئے اور ساتھ ہی آسٹریلیا مسجد میں بعد از نماز فجر درس وتدریس کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔

جولائی ۱۹۵۴ء کے شروع میں درسِ قرآن سے متعلقہ ایک میٹنگ کا ذکر ہے۔ جس میں خواجہ عبدالحئی فاروقی‘ مولانا مرغوب احمد اور دیگر متعلقہ صاحبان کی شمولیت ہوئی اور پیش آمدہ مسائل پر غور وفکر ہوا۔ ۱۱ستمبر کو بعد از نماز عصر ادارہ کی میٹنگ ہوئی۔ رسالہ درس قرآن‘ پروف پڑھنے اور اخبارات میں اس کے متعلق تبصرہ کے لیے مشورہ ہوا۔ ۲۰ نومبر کو درس قرآن کی مشاورتی مجلس کا اجلاس ہوا جس میں خواجہ عبدالحئی فاروقی‘ مولانا مرغوب احمد اور اباجی شریک ہوئے۔ چوتھے رکن حافظ نذر محمد اشد مصروفیت کی وجہ سے نہ آسکے۔ لگتا ہے کہ پانچویں رکن مولوی بشیر احمد کسی وجہ سے فعال نہ ہو پائے (راقم)۔ جنوری ۱۹۵۵ء کے وسط میں ادارہ اصلاح وتبلیغ کی میٹنگ ہوئی جس میں اباجی کو پندرہ روزہ ’درس قرآن‘ کا پرنٹر اور پبلشر نامزد کیا

گیا۔ فروری کے اوائل میں اباجی تھانہ نولکھا گئے اور پرنٹر و پبلشر کی حیثیت سے ایک سوالنامہ کے جوابات تحریراً دیے۔ مارچ کے وسط میں اباجی نے کچہری جا کر درسِ قرآن کے ڈیکلریشن پر دستخط کر دیے۔ جولائی ۱۹۵۵ء کے اوائل میں ''سہ پہر کو خواجہ عبدالحئی کے ہاں پھر درس قرآن کی مشاورتی کمیٹی جمع ہوئی۔ تخلیق آدم پر بحث نے اتنا طول کھینچا کہ سب بزرگوں کو عرض کیا کہ جس امر کا فیصلہ نہ ہو سکے اور دونوں توجیہات میں کوئی حرج بھی نہ ہو (تو) وہ دونوں اقوال ہی بیان کر دیے جائیں۔ خواجہ عبدالحئی فاروقی شارح ہیں مگر مرغوب احمد توفیق بھی مفکّر آدمی اور اپنے نظریے رکھتے ہیں۔''

فروری ۱۹۵۸ء کے شروع میں بھی 'درس قرآن بورڈ' کے اجلاس ہوئے' جس میں بورڈ کے رکن حافظ نذر محمد کے بارے میں تبادلہ خیال ہوا اور طے پایا کہ بورڈ کے منظور شدہ مسودے میں اگر کانٹ چھانٹ کی جائے تو بورڈ اس کا ذمہ دار نہ ہوگا اور نہ ہی اسے دینی سند حاصل ہوگی۔ ہفتہ دس دن بعد بورڈ کا دوبارہ اجلاس ہوا اور فیصلہ ہوا کہ حافظ نذر محمد صاحب کی کانٹ چھانٹ کا ایک مرتبہ جائزہ لے کر پھر حتمی فیصلہ کیا جائے۔ مئی ۱۹۵۸ء میں ادارہ اصلاح وتبلیغ کی ایک بھرپور میٹنگ ہوئی اور فیصلہ ہوا کہ 'درس قرآن' کے دیباچہ میں کوئی نام نہ ہو' اس میں حُبِّ جاہ پائی جاتی ہے۔

۹ جنوری ۱۹۵۹ء بعد از نماز جمعہ درس قرآن کی میٹنگ ہوئی۔ خواجہ عبدالحئی فاروقی صاحب آنکھ کے کامیاب آپریشن کے بعد گھر منتقل ہو چکے تھے۔ متعلقہ اسباب نے تازہ مسودہ دیکھا اور تبادلہ خیال ہوا۔ ۱۷/اپریل کو بعد از نماز جمعہ پھر درس قرآن کی میٹنگ ہوئی جس میں خواجہ صاحب سمیت دوسرے ارکان شامل ہوئے۔ حدیث کا درس اباجی نے لکھوایا۔ اوائل جولائی میں بھی درسِ قرآن کی میٹنگ ہوئی' جس میں خواجہ عبدالحئی نے درس قرآن کے رسالہ پر اپنا نام نہ لکھنے کے لیے لکھ دیا: ''بندہ نے بھی اپنے بارے میں تائید کر دی''۔ جولائی کے وسط میں ایک آم پارٹی ہوئی۔ بقول اباجی ''ظہر کے بعد چوہدری عبدالعزیز (سیکرٹری ادارہ اصلاح وتبلیغ)' خواجہ عبدالحئی اور مرغوب صاحب تشریف لائے۔ آم برف میں لگا کر رکھے تھے۔ سب نے کھائے۔ ہم چاروں سے جو بچ گئے' وہ گھر میں دے دیے۔ عصر کے بعد لسّی پی کر رخصت ہوئے''۔ اکتوبر ۱۹۵۹ء کے وسط میں یکے بعد دیگرے ادارہ اصلاح وتبلیغ کا اجلاس اور درس قرآن کی میٹنگ ہوئی اور متعلقہ امور سرانجام پائے۔ خصوصاً درس قرآن میٹنگ میں

حضرت یوسف علیہ السلام کی زلیخا کے ہاتھوں آزمائش کا ذکر رہا اور پردہ نہ کرنے کے نتائج پر بات چیت ہوئی۔ ۲۳ دسمبر کو بعد از نماز ظہر اباجی' خواجہ صاحب اور دیگر شرکاء کے ساتھ درسِ قرآن کے اجلاس میں شریک ہوئے۔ مرغوب صاحب کو ایک بار پھر آسان لکھنے کی درخواست کی۔ پہلی منزل ایک ہزار ختم ہو رہی ہے۔ فوری طور پر دوسرا ایڈیشن چھپوا رہے ہیں۔ اواخر جنوری ۱۹۶۱ء میں پھر ظہر کے بعد درس قرآن کی میٹنگ کا ذکر ہے' جس میں بطور خاص گاجر کا حلوہ بھی کھایا گیا۔ خواجہ عبدالحئی فاروقیؒ کے حوالے سے یہ تذکرہ بھی ہے کہ مالک مکان کے اصرار اور تکرار پر وہ اپنا کرائے کا مکان چھوڑنے کا وعدہ کر چکے ہیں اور نئے مکان کے ملنے کے بارے میں بھی اظہارِ تشویش ہے۔ اپریل کے دوسرے ہفتے میں فاروق گنج (لاہور) جا کر خواجہ عبدالحئی کے مکان میں درسِ قرآن کی میٹنگ کا ذکر ہے۔

۲۴/جولائی بعد نماز عصر تاج کمپنی' مفتی خلیل الرحمٰن (مینیجر) کے ہاں ادارہ اصلاح وتبلیغ کی میٹنگ ہوئی۔ تمام متعلقہ ارکان موجود تھے۔ درس قرآن کے متعلق مشورہ ہوا۔ اکثریت کی رائے تھی کہ کسی اور کے سپرد کرنے کی بجائے ادارہ خود ہی اس کی طباعت واشاعت کرے۔ ۲۷ جولائی کی صبح تاج کمپنی میں پھر ادارہ کی مجلس کا اجلاس ہوا اور اس بات کا حتمی فیصلہ ہوا کہ درس قرآن کی طباعت تو خود ہی کروائی جائے' البتہ اشاعت میں کوئی اور مدد دے تو اسے معقول کمیشن دیا جائے۔ تیسری منزل پر نظر ثانی شروع کرنے کا فیصلہ ہوا۔ بعد میں اباجی سیکریٹریٹ گئے اور متعلقہ برانچ میں جا کر درس قرآن کے ڈیکلریشن پر دستخط کر دیے۔

۳۱ جولائی کو اباجی نے کچہری جا کر درس قرآن کے ڈیکلریشن کی مجسٹریٹ سے تصدیق کروالی۔ گویا اس کی منظوری ہوگئی۔ واپس دفتر ادارہ میں آ کر متعلقہ چھاپہ خانہ میں منظوری کی دستی اطلاع بھجوائی گئی اور رسالہ درس قرآن جلدی چھاپنے کی تاکید کی گئی۔ اس دوران رسالہ جات درس قرآن پر نظر ثانی کی ذمہ داری بھی اباجی کے سپرد ہی رہی۔ اوائل دسمبر میں پھر درس قرآن کی میٹنگ ہوئی' جس میں رسالہ درس قرآن کو قرآن مجید کی شکل میں چھاپنے کی تجویز پر غور ہوا۔

(جاری ہے)

میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

Apr.2016
vol.65

Regd.CPL NO. 115
NO.4

Monthly **Meesaq** Lahore

محترم ڈاکٹر صاحبؒ کے شخصی احوال، سوانح اور گراں قدر علمی، دینی و قرآنی خدمات
کے تذکرہ پر محیط ایک جامع اور مبسوط دستاویز

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

شخصیت اور دینی خدمات

محترمہ رافعة الجبين

کا ایم ایس علومِ اسلامیہ کا 5 ابواب پر مشتمل تحقیقی مقالہ:

- ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کے حالاتِ زندگی اور ان کا دور
- ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی دعوتی، تبلیغی اور تنظیمی خدمات
- ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی خدماتِ تفسیر قرآن
- ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفی اور تالیفی خدمات
- ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کے افکار اور عصر حاضر

دیدہ زیب ٹائٹل ۞ امپورٹڈ بک پیپر ۞ اعلیٰ معیاری طباعت
۞ صفحات: 320 ۞ قیمت: صرف 250 روپے

شائع کردہ

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36۔ کے، ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون: 3-35869501
Email: maktaba@tanzeem.org Website: www.tanzeem.org